اسلام میں عورت کے حقوق

مصنف

سید جلال الدین عمری

ناشر

اسلامک پبلیکیشنز لاہور

اسلام

میں

عورت کے حقوق

سید جلال الدین عمری

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ای۔شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

طابع : ـــــــــــ رانا اللہ داد خاں، مینجنگ ڈائریکٹر
ناشر : ـــــــــــ اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
مطبع : ـــــــــــ زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
اشاعت :

۱ تا ۲	فروری ۱۹۸۷ء تا فروری ۱۹۹۰ء	۲۲۰۰
۳	نومبر ۱۹۹۳ء	۱۱۰۰

قیمت : ۳۳/۰۰ روپے

نذرانۂ عقیدت

ان اوراق کو میں بصد ادب و احترام اپنی
والدہ ماجدہ محترمہ زینب بی بی صاحبہ
کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں،
جن کے قدموں کے نیچے میری جنت ہے اور جن
کی دعائیں اور نیک تمنائیں زندگی بھر میرے ساتھ رہیں
امید ہے آئندہ بھی وہ سرمایۂ حیات بنی رہیں گی۔
اللہ تعالیٰ تا دیر ان کا سایہ سلامت رکھے۔ آمین۔

خادم
جلال الدین
۳ مارچ ۱۹۹۶ء

فہرست مضامین

مہر کی نوعیت اور اس کے احکام

تعدد ازواج

طلاق کا مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

جن اسلامی موضوعات پر اد ھر ایک عرصہ سے علمی حلقوں میں بحث مباحثہ جاری ہے ان میں عورت کے حقوق کا موضوع متعدد پہلوؤں سے بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ اس پر جدید ذہن کو کئی ایک شدید اعتراضات ہیں۔ اس کتاب میں پہلے مختصر طور پر وہ حقوق بیان کیے گئے ہیں جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں۔ اس کے بعد ان نمایاں اعتراضات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے جو اس موضوع پر کیے جاتے ہیں۔ اس میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان کے تمام اطراف وجوانب کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بحث کا دائرہ اعتراضات کے جواب تک محدود ہو اور اس سلسلہ میں جو الجھنیں پائی جاتی ہیں وہ رفع ہو جائیں۔ ان میں سے بعض مسائل پر میں اپنی دوسری تحریروں میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ یہاں ان پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی ہے[1]۔

کسی بھی مسئلہ میں بحث کا انداز نہ تو مناظرانہ ہے جس میں سمجھنے سمجھانے کا جذبہ نایید ہو جاتا ہے اور نہ تاثراتی ہے جس میں آدمی کے اپنے جذبات واحساسات آگے آگے چلتے ہیں اور علمی تجزیہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کی جگہ خالص علمی انداز میں قرآن، حدیث اور فقہ کی روشنی میں جوابات دیے گئے ہیں اور کوئی بات بلا حوالہ اور بغیر سند کے نہیں کہی گئی ہے۔ حوالوں کو

---

[1] اسلامی معاشرت پر میری حسب ذیل کتابیں اور رسالے شائع ہو چکے ہیں: (۱) عورت اسلامی معاشرہ میں (۲) عورت اور اسلام۔ (۳) مسلمان خواتین کی دینی ذمہ داریاں۔ (۴) بچے اور اسلام۔ دو ضخیم کتابیں زیر ترتیب ہیں (۱) خاندان ۔ اسلامی تعلیمات میں۔ (۲) والدین کے حقوق اور فرائض۔ ان کتابوں کے مختلف مباحث ماہنامہ زندگی رام پور، الفرقان لکھنو اور برہان دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

خواہ مخواہ طویل کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ موقع پر بالعموم صرف کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مصنف، مطبع، ایڈیشن وغیرہ کی تفصیل کتاب کے آخر میں دے دی گئی ہے۔

مسلمان عورت کے حقوق پر اعتراضات چونکہ مغرب کے زیر اثر کیے جاتے ہیں اس لیے شروع ہی میں آزادیٔ نسواں۔ کے مغربی تصور کا تھوڑا سا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اپنی ظاہری چمک دمک کے باوجود اس کے تاریک پہلو بھی ہیں۔ یہ ہمارے لیے قابل تقلید نہیں ہے۔

اس موضوع پر تنقید و اعتراض کا سلسلہ غالباً اس گروہ کی طرف سے شروع ہوا جس کی اسلام سے دشمنی اور مخالفت مشہور و معروف تھی لیکن اب بدقسمتی سے بہت سے مسلمان دانشور بھی اس میں شریک ہو گئے ہیں یہ دانش ور حضرات اپنے حلقوں میں کتنے ہی قابل اور محقق سمجھے جاتے ہوں اور ان کو عزت و احترام کا جو بھی مقام حاصل ہو ان کی تعداد مسلمانوں میں برائے نام ہے۔ کتاب میں ان ہی لوگوں کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن اس وقت عام مسلمانوں سے بھی، جن میں کا ایک فرد خود لکھنے والا بھی ہے اور جو ان میں پائی جانے والی کمزوریوں سے پاک نہیں ہے، کچھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عام مسلمان اپنے اس یقین اور ایمان کا زبان سے اظہار تو کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں وہ خدائے تعالیٰ کے دیئے ہوئے ہیں۔ یہ حقوق لازماً ادا ہونے چاہئیں۔ ان میں ترمیم و تنسیخ کو وہ اللہ تعالیٰ کے قانون میں براہ راست مداخلت تصور کرتے ہیں اور اسے روکنے اور اس قانون کو صحیح شکل میں باقی رکھنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار نظر آتے ہیں، لیکن عملاً وہ ان احکام کے پوری طرح پابند نہیں ہیں بلکہ قدم قدم پر اس کی خلاف ورزی ان سے ہوتی رہتی ہے۔ باپ بیٹی کے حقوق نہیں ادا کرتا۔ اس کی تعلیم و تربیت کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنی توجہ کہ لڑکوں کی تعلیم کی طرف دی جاتی ہے لین دین میں دونوں میں فرق کیا جاتا ہے، مختلف بہانوں سے وہ حقِ وراثت سے محروم رکھی جاتی ہے۔ ماں اور باپ کے ساتھ اولاد کا رویہ خاص طور پر شادی اور اپنا گھر بسانے کے بعد بہت غلط ہوتا ہے، ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہوتا۔ ان کے قانونی حقوق ادا نہیں کیے

جاتے۔ ان کے پاس اگر کوئی ذریعۂ معاش نہ ہو تو وہ عسرت کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بیوی کو شوہر کی محبت نہیں ملتی بسا اوقات سسرال میں اس کے ساتھ ملازمہ کی طرح سلوک ہوتا ہے۔ وہ اپنے بہت سے حقوق سے محروم رہتی ہے۔ بات بات پر سختی شروع ہو جاتی ہے۔ معمولی سے اختلافات طلاق کا بہانہ بن جاتے ہیں۔ مہر کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وہ طلاق کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ طلاق نہ ہو تو اس کے ادا کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی۔ یہی رویہ بالعموم ان تمام عورتوں کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے جن کے حقوق اسلام نے مرد پر عائد کر رکھے ہیں، اور جن کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے۔ اسلام نے (اپنے حدود کے اندر) عورت کو معاشی جدوجہد کی اجازت دی ہے، وہ اسے تعلیم میں آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ اسے دعوت و تبلیغ، نشر و اشاعت، تنقید و احتساب اور سیاسی و سماجی خدمات کا حق ہے لیکن عملاً ان میں سے کسی میدان میں اس کا وجود نہیں ہے۔ پھر دنیا کیسے یقین کر سکتی ہے کہ اسلام نے اسے ترقی کے تمام مواقع فراہم کیے ہیں اور اسے وہ سب کچھ دیا ہے جو اسے ملنا چاہیے؟

اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں مسلم معاشرے میں اگر ان کا احترام پیدا ہو جائے اور وہ ٹھیک ٹھیک ادا کیے جانے لگیں تو وہ مسائل ہی شاید پیدا نہ ہوں جن کا حوالہ دے کر پورے اسلامی قانون ہی کو بدنام کرنے اور اسے بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر مسلمان خود عورت کے حقوق ادا نہ کریں تو وہ کس منہ سے دوسروں سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقوق ان کے لیے پوری طرح واجب الاحترام ہیں، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو وہ گوارا نہیں کر سکتے۔ ان کی بے عملی خود اس بات کی دلیل بن جائے گی کہ اس کی تقدیس ختم ہو چکی ہے اور اس کی کم از کم عملی اہمیت باقی نہیں رہی ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں وہ اگر خوش دلی سے ادا نہ کیے جائیں تو ان کے حصول کے لیے وہ غیر اسلامی قوانین کا سہارا لے سکتی ہے۔ اس کے اندر یہ احساس بھی ابھر سکتا ہے کہ جس قانون سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اسے بدل ہی جانا چاہیے۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ واقعات اس کی تائید کر رہے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ پورا معاشرہ اسلام کی طرف پلٹے اور خلوص

کے ساتھ اس کے احکام کا پابند ہو جائے۔

آخر میں عرض ہے کہ یہ ایک حقیر سی دفاعی کوشش ہے۔ اس میں غلطیوں کے بڑے امکانات ہیں، ایسے افراد کی ہم میں کمی نہیں ہے جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس میں جہاں کہیں کوئی خامی محسوس کریں اس سے آگاہ فرمائیں۔ آئندہ اس کی اصلاح کر دی جائے گی اور یہ بے مایہ اس کے لیے بے حد شکر گزار ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کے لیے لکھی گئی ہے وہ پورا ہو، اس کے بندوں کو اس سے نفع پہنچے اور اس ناکارہ کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔

جلال الدین عمری

۲۱ر فروری ۱۹۸۶ء

آزادئ نسواں کا مغربی تصوّر اور اس کے نتائج

تاریخ کے ایک طویل عرصے سے عورت مظلوم چلی آرہی تھی۔ وہ ہر قوم میں اور ہر خطہ میں مظلوم تھی۔ یونان میں، روم میں، مصر میں، عراق میں، ہند میں، چین میں، عرب میں ہر جگہ اس پر ظلم ہو رہا تھا۔ بازاروں اور میلوں میں اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی، حیوانوں سے بدتر اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ یونان میں عرصہ تک یہ بحث جاری رہی کہ اس کے اندر روح ہے بھی یا نہیں؟ اہلِ عرب اس کے وجود ہی کو موجب عار سمجھتے تھے۔ بعض شقی القلب اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ہندوستان میں شوہر کی چتا پر اس کی بیوہ جل کر راکھ ہو جاتی تھی۔ راہبانہ مذاہب اسے معصیت کا سرچشمہ، گناہ کا دروازہ اور مجسم پاپ سمجھتے تھے۔ اس سے تعلق کو روحانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا جاتا تھا۔ دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں اس کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی، وہ حقیر اور ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اس کے معاشی اور سیاسی حقوق نہیں تھے۔ وہ آزاد مرضی سے لین دین اور کوئی مالی تصرف نہیں کر سکتی تھی۔ وہ باپ کی، پھر شوہر کی اور اس کے بعد اپنی نرینہ اولاد کی تابع اور محکوم تھی۔ ان کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی اسے اجازت نہ تھی۔ ان کے ظلم و ستم پر اس کی کہیں داد رسی نہ ہوتی تھی، اسے فریاد کا بھی حق حاصل نہ تھا۔

اس میں شک نہیں بعض اوقات عورت کے ہاتھ میں زمام اقتدار بھی رہی ہے، ایسا بھی ہوا ہے کہ سلطنت اور حکومت اس کے اشاروں پر گردش کرتی رہی ہے۔ یہ تو بہت دیکھنے میں آیا کہ خاندان اور قبیلہ پر وہ چھائی ہوئی تھی۔ بعض غیر متمدن قبائل میں عورت کو مرد پر ایک طرح کی بالادستی بھی حاصل رہی ہے اور اب بھی اس طرح کے قبائل موجود ہیں لیکن اس کے باوجود بہ حیثیت نوع عورت کے حالات میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا، وہ مظلوم کی مظلوم ہی رہی۔ اس کے حقوق پر دست درازی جاری رہی۔

اسلام نے عورت کو ظلم کے گرداب سے نکالا، اس کے ساتھ انصاف کیا، اسے انسانی حقوق دیئے، عزت و سربلندی بخشی اور معاشرہ کو اس کا احترام سکھایا۔ لیکن مغرب کی جو قومیں اسلام

کے سایۂ رحمت میں نہ آ سکیں وہ اس کے برکات وثمرات سے محروم رہیں۔ ان میں عورت کے حقوق بدستور پامال ہوتے رہے اور وہ ہر طرح کا ظلم سہتی رہی۔ موجودہ دور میں جب ان قوموں میں اس کا ردِ عمل ہوا تو عورت کی آزادی اور مساوات کا تصور ابھرا۔ اس کے حق میں دلائل فراہم کیے گئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نوعی اختلاف کے باوجود عورت مرد سے فروتر نہیں ہے۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے برابر ہیں ان میں کسی بھی پہلو سے فرق وامتیاز صحیح نہیں ہے۔ وہ ہر کام کر سکتی ہے، ہر عہدہ ومنصب کی اہل ہے، وہ ہر طرح آزاد ہے، لہٰذا مرد کو بالادستی اس پر سے ختم ہونی چاہیے اور اسے وہ سارے حقوق ملنے چاہئیں جو مرد کو حاصل ہیں۔

عورت کے لیے یہ بڑا دل خوش کن تصور تھا۔ اس نے لپک کر اسے اس طرح قبول کیا جیسے فردوسِ گم گشتہ اسے مل گئی ہو۔ اور آہستہ آہستہ معاشی، معاشرتی، سماجی اور تہذیبی امور میں مرد کی شریک بنتی چلی گئی۔ وہ کارخانوں، دفتروں اور کالجوں میں مرد کے شانہ بشانہ معاشی جد وجہد کر رہی تھی تو پارکوں، کلبوں، گھروں اور تفریح گاہوں میں اس کے ساتھ کھیل کود اور تفریح میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کا وجود ہر شعبۂ حیات میں ضروری قرار پایا اور اس کے بغیر زندگی بے کیف اور بے لطف تصور کی جانے لگی۔ عورت نے اسے 'ترقی' کی طرف پیش رفت سمجھا اور ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اٹھانے کے لیے بے چین اور مضطرب رہنے لگی۔ وہ اس کے ظاہری حسن پر فریفتہ تھی اور اس کے بطن میں چھپی ہوئی خرابیوں کو نہ دیکھ سکی۔

مغرب نے عورت کی آزادی کا جو تصور دیا وہ بعض پہلوؤں سے اس کے حق میں مفید تھا تو بعض پہلوؤں سے نقصان دہ بھی تھا۔ اس میں ایک طرف عورت کو مرد کے ظلم سے نجات دلائی گئی تھی تو دوسری طرف اس کی قوت وصلاحیت، مزاج اور نفسیات کی قطعاً کوئی رعایت نہیں کی گئی تھی۔ یہ درحقیقت مرد کے ظلم کے خلاف ایک شدید ردِ عمل تھا۔ اس میں وہ ساری بے اعتدالیاں موجود تھیں جو اس طرح کے ردِ عمل میں بالعموم پائی جاتی ہیں۔

عورت کی اس بے قید آزادی نے مغرب کی پوری زندگی کو بالکل غلط رخ پر ڈال دیا ہے اور اس سے ایسا عدم توازن پیدا ہوا ہے کہ اس کے برے گندے نتائج سامنے آچکے ہیں۔ اسلام اس نازک موڑ پر ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ وہ عورت کے بنیادی حقوق اور اس کی ہمہ جہتی ترقی کی ضمانت بھی دیتا ہے اور معاشرہ کو ان آزادیوں اور ان کے نتائج سے محفوظ رکھتا

بھی رکھتا ہے جن سے مغرب اس وقت دوچار ہے۔ ان میں سے بعض معاشرتی وسیاسی نتائج کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

جنسی بے راہ روی

زندگی کے ہر گوشہ میں عورت اور مرد کے آزادانہ اور بے باکانہ اختلاط کی وجہ سے جنسی آوارگی کا رجحان پیدا ہوا اور بڑھا، بدکاری عام ہوئی اور چھاگئی۔ پھر اس کی بنیاد پر ایک ایسی ننگی اور بے حیا تہذیب نے جنم لیا کہ اس کی عفونت اور بدبو سے اخلاق کا چمن اجڑ گیا اور شرم وحیا اور شرافت کا دم گھٹ کر رہ گیا۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی عورت گھر سے نکل کر 'شمع انجمن' بنی اور مجلسوں اور محفلوں کی رونق بڑھانے لگے تو جنسی آوارگی پھیلی، جو گندگی بند کمروں میں برداشت نہیں کی جاسکتی وہ بازاروں اور سڑکوں میں پھیلنے لگی، انتہائی قابل احترام اور پاکیزہ رشتے بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ عام افراد کا کیا ذکر ہی کیا ان کے دیوی دیوتا تک بدکاریوں میں ملوث پائے گئے اور ان کی طرف ایسی ایسی داستانیں منسوب کی جانے لگیں کہ آدمی شرم سے پانی پانی ہوجائے۔ بیسواؤں اور رنڈیوں کو وہ مقام حاصل ہوا جس سے شریف عورتیں تک محروم تھیں، آرٹ اور کلچر سے جنسی جذبات کی ترجمانی ہونے لگی، عریاں تصویریں کھینچیں، ننگے مجسمے تراشے گئے، رقص وموسیقی کے نام پر عورت سے لذت حاصل کی گئی، افسانہ، ڈرامہ، شاعری اور ادب کے ذریعہ جنسی اعمال وکیفیات کی تشریح ہونے لگی، عورت مرد کے ہاتھ میں کھلونا بن گئی اور اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ مرد کی جنسی خواہش کی تکمیل کرے غرض پوری تہذیب جنس کی ترجمان بن گئی اور اسی کے ارد گرد گھومنے لگی۔ جنسی جذبات کی اس حکمرانی نے یونان، روم، مصر، اور دوسری بہت سی قدیم تہذیبوں کو تباہ وبرباد کردیا۔ تہذیب نو بھی اسی راستہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شاید وہ وقت قریب آگیا ہے جب کہ یہ قصر منہدم ہوجائے اور ایک نئی تہذیب وجود میں آئے۔

خاندان کی بربادی

خاندانی نظام عورت کی وجہ سے قائم تھا۔ اس کے اندرونی نظم ونسق کو وہ سنبھالے ہوئے

تھی عورت کی تگ ودو جب گھر سے باہر ہونے لگی اور بیرونی مصروفیات نے اس کے اوقات کو گھیر لیا تو خاندان کا نظم بکھر گیا۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا اس کی قیمت گھر کی بربادی کی شکل میں اسے ادا کرنی پڑی۔ خاندان معاشرہ کا بنیادی پتھر ہے۔ جب یہ اپنی جگہ سے ہٹا تو پورا معاشرہ درہم برہم ہو گیا۔ عورت مرد کے لیے وجہ سکون تھی اب نہیں رہی، ان کے درمیان وہ محبت باقی نہیں رہی جس کی وجہ سے زندگی کے نشیب و فراز میں وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ والدین اور اولاد کا مضبوط رشتہ کم زور پڑ گیا، اولاد کے لیے والدین مرکز محبت ہوتے ہیں، یہ مرکز ان سے چھن گیا اور وہ نرسنگ ہاؤزس کے حوالے ہو گئے، والدین کے بڑھاپے کا سہارا ان کی اولاد ہوتی ہے۔ یہ سہارا ٹوٹ گیا، اور وہ انتہائی بے بسی اور کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی نہیں وہ سارے تعلقات جو خاندان کی بقا کے ساتھ وابستہ تھے اس کے ٹوٹتے ہی ختم ہوتے چلے گئے اور انسان اس سکون سے محروم ہو گیا جو صرف خاندان ہی فراہم کر سکتا ہے۔ خاندان کا ٹوٹنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اتنا بڑا خسارہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ زیادہ دن اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ بالآخر وہ اسے لے ڈوبے گا۔

اسلام ایک مضبوط اور پائیدار خاندان کو معاشرہ کی بقا کے لیے ضروری سمجھتا ہے اس لیے کہ خاندان ہی کی بنیاد پر معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے۔ خاندان کا استحکام معاشرہ کا استحکام اور خاندان کی بربادی معاشرہ کی بربادی ہے۔ اسلام خاندان کی تعمیر و تشکیل کے لیے بہت ہی مضبوط بنیادیں فراہم کرتا ہے اور ان اسباب و عوامل سے اسے محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو اسے کم زور یا منہدم کر کے رکھ دیں۔ اس کا ایک پورا نظام اس نے قائم کیا ہے، اس کی تفصیلات بتائی ہیں اور حدود و ضوابط متعین کیے ہیں۔ وہ اس بات کی شدت سے تاکید کرتا ہے کہ اس نظام کو جوں کا توں باقی رکھا جائے اور اللہ کے قائم کردہ حدود نہ توڑے جائیں۔ اس نظام میں عورت کی بنیادی اہمیت ہے۔ اور وہ اس کی تعمیر کا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس میں اس کے حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی اگر وہ اس سے کنارہ کش ہو جائے اور یکسوئی کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں ادا نہ کرے تو یہ نظام بکھر کر رہ جائے گا۔ وہ اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب کہ عورت اسے اپنی سعی و جہد اور توجہ کا مرکز بنائے رکھے۔

حقوق اور ذمہ داریوں میں عدم توازن

عورت کے حقوق اور ذمہ داریوں میں عدم تناسب پیدا ہوگیا اور ان میں جو توازن اور اعتدال ہونا چاہیئے وہ ختم ہوگیا۔ فطرت اس طرح عورت کی نشوونما کرتی ہے کہ وہ ماں بن سکے اور اس کی گود میں نسل انسانی پروان چڑھے۔ اس کے لیے جن جذبات واحساسات اور جن قوتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ بھی اسے فطرت کی طرف سے ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے خود اس کے اندر اس فطری تقاضہ کو پورا کرنے کا شدید داعیہ پایا جاتا ہے۔ لیکن ماں بن کر نسل انسانی کو آگے بڑھانا کوئی وقتی اور ہنگامی مشغلہ نہیں ہے بلکہ ایک طویل اور دشوار گزار عمل ہے۔ اس میں حمل، ولادت، رضاعت، بچہ کی پرورش اور اس کی تربیت وغیرہ شامل ہیں۔ اس سارے عمل میں مرد بعض حیثیتوں سے اس کا شریک تو ہوتا ہے اور بالواسطہ اس کے ساتھ تعاون بھی کرتا ہے لیکن براہ راست اس کا بوجھ نہ اٹھاتا ہے اور نہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ سارا بوجھ تنہا عورت ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس میں اس کی توانائیوں اور صلاحیت کا بڑا حصہ صرف ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس پر وہ ساری سیاسی، سماجی اور معاشی ذمہ داریاں بھی ڈال دینا جو مرد پر عائد ہوتی ہیں، بہت بڑی زیادتی ہے۔ اس کے لیے وجہ جواز شائد اسی وقت فراہم کیا جاسکتا ہے جب کہ عورت کو اس بوجھ سے سبک دوش کردیا جائے جو فطرت نے اس پر ڈال رکھا ہے اور جس کے لیے خاص طریقہ سے اس کی نشوونما کی ہے۔ لیکن عورت جب تک عورت ہے اور اس کے پاکیزہ جذبات اور اس کی بہترین صلاحیتوں کی نسل انسانی کے بقا اور اس کی ساخت وپرداخت کے لیے ضرورت ہے، اس وقت تک یہ بوجھ بہرحال اس پر باقی رہے گا۔ کسی مصنوعی طریقہ سے نہ اسے ہٹایا جاسکتا ہے اور نہ اس کا کوئی بدل فراہم کیا جاسکتا ہے۔

اس بارے میں اسلام ایک معتدل اور متوازن نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ وہ عورت کو وہ سارے معاشی سیاسی اور سماجی حقوق دیتا ہے جو مرد کو اس نے دئے ہیں، البتہ اسے بعض ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کر رکھا ہے جو اس کے ذہنی و جسمانی ساخت سے مناسبت نہیں

رکھتیں اور جن کے اٹھانے کے بعد وہ اپنی فطری ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ مرد ہی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ملک کے دفاع کی ذمہ داری بھی براہ راست اسی پر ہے۔ گویہ ذمہ داریاں عورت پر نہیں ڈالی گئی ہیں لیکن اسے دوسرے سارے سیاسی حقوق حاصل ہیں۔ وہ سیاست میں رائے اور مشورہ دے سکتی ہے۔ تنقید اور احتساب کا اسے حق حاصل ہے۔ وہ ریاست کے بڑے سے بڑے صاحب منصب حتیٰ کہ حاکم وقت کو بھی برسر عام ٹوک سکتی ہے۔ اس کے اس حق پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ ایک اور مثال لیجئے عورت پر کسی کی معاشی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اسے معاشی جدوجہد کا حق حاصل ہے۔ وہ اسلام کے قائم کردہ حدود کے اندر یہ جدوجہد کرسکتی ہے۔

اسلام نے مرد پر جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں، ان کی تکمیل کے لیے اسے کچھ زیادہ حقوق بھی دیئے ہیں، لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ عدل و انصاف برقرار رہے اور عورت پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے اسلام نے مرد پر سخت قانونی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور عورت کے حقوق محفوظ کردیئے ہیں۔ خاندان میں مرد قوام اور نگران ہے لیکن قانوناً وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کرسکتا۔ جب بھی اس کی طرف سے کوئی زیادتی ہوگی قانون اس کی گرفت کے لیے موجود ہوگا یہی نہیں سربراہ مملکت بھی اس کی جان، مال، عزت، آبرو اور دوسرے انفرادی و اجتماعی حقوق پر دست درازی کا اختیار نہیں رکھتا۔ وہ قانون کے سامنے ایک عام فرد کی طرح جواب دہ ہوگا۔

عورت سے ہمدردی کے جذبہ میں کمی

آخری بات یہ کہ مرد نے عورت پر بے شک بڑی زیادتیاں کی ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کے اندر عورت سے محبت اور ہمدردی کا ایک فطری جذبہ بھی ہے۔ اسلام اس جذبہ کو ابھارتا اور نشوونما دیتا ہے۔ وہ اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ عورت کے قانونی حقوق ہی ادا نہ کیے جائیں بلکہ اس کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے وہ حسن سلوک کی مستحق ہے لہٰذا اس کے ساتھ حسن سلوک

ہونا ہی چاہیے۔ اس جذبہ کی عورت اور مرد کے تعلقات میں اساسی اہمیت ہے۔ موجودہ دور میں عورت اور مرد کے درمیان حقوق کی جنگ نے اس جذبہ کو مجروح اور نیم جان کر دیا ہے کبھی کبھی تو خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ مقدس جذبہ دم توڑ چکا ہے۔ اس سے عورت کا بڑا نقصان ہوا۔ اس لیے کہ صرف قانون چاہے وہ آب زر سے کیوں نہ لکھ دیا جائے اس کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات کا دعویٰ تو کیا جاتا ہے لیکن عملاً مساوات برتی نہیں جاتی۔ قانون نے اسے جو سیاسی سماجی اور معاشرتی حقوق دیے ہیں ان سے وہ پوری طرح بہرہ یاب نہیں ہے اور کہیں کہیں تو اس پر ظلم و زیادتی آخری حد کو پہنچ چکی ہے۔ مرد کی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس کی باقاعدہ خرید فروخت ہو رہی ہے۔ اس کی جان و مال پر حملے ہو رہے ہیں اور اس کی عصمت و آبرو بھی بے دریغ لوٹی جا رہی ہے۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قدم قدم پر ہونے والے نت نئے حملوں کا دفاع کرنا بھی اسے دشوار ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کمزور کے حقوق تسلیم کر بھی لیے جائیں تو ان سب کا اسے ملنا آسان نہیں ہے۔ عورت لڑ کر یہ حقوق مرد سے حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ اسے صرف اسی صورت میں مل سکتے ہیں جب کہ مرد انھیں دینا چاہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر ہمدردی اور محبت کا جذبہ ہو اور وہ عورت کے ساتھ زیادتی کو جرم اور گناہ سمجھے۔ اسلام نے اس معاملہ میں بے نظیر کامیابی حاصل کی ہے۔ تاریخ کے اس تجربہ کو جب بھی دہرایا جائے گا معاشرہ میں ایک بار پھر وہی بہار آئے گی جسے دنیا اس سے پہلے دیکھ چکی ہے۔

مسلمان عورت کے

حقوق

مسلمان عورت کے حقوق

عام طور پر کمزور کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے سخت جد وجہد اور کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر اسے اس کے جائز حقوق نہیں ملتے بلکہ وہ تسلیم بھی نہیں کیے جاتے۔ موجودہ دور نے بڑی بحث وتمحیص، بڑی ردوکد اور بڑے احتجاج کے بعد عورت کے بعض بنیادی حقوق تسلیم کیے۔ اسے اس دور کا احسان مانا جاتا ہے حالانکہ یہ احسان اسلام کا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عورت کو وہ حقوق دیے جن سے وہ عرصۂ دراز سے محروم چلی آرہی تھی۔ یہ سارے حقوق اسلام نے اس لیے نہیں دیے کہ عورت ان کا مطالبہ کر رہی تھی، اس کا احتجاج جاری تھا اور اس کے حقوق کی وکالت اور نمائندگی ہو رہی تھی بلکہ اس لیے دیے کہ عورت کے یہ فطری حقوق تھے اور اسے ملنا ہی چاہیے تھے۔ اسلام ان حقوق کے دینے پر مجبور نہیں تھا بلکہ اس لیے دیئے کہ عورت مظلوم تھی اور مظلوم کی حمایت کو وہ فرض سمجھتا تھا۔

یہاں بعض ان حقوق کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں۔ اسلام ان حقوق کو صرف قانون کی زبان میں بیان کر کے خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ ترغیب وترہیب کے ذریعہ ان کے ادا کرنے کا زبردست جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔

زندہ رہنے کا حق

عورت کا جو حال پوری دنیا میں تھا وہی عرب میں تھا۔ عرب کے بعض قبائل اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ قرآن مجید نے اس شقاوت اور سنگ دلی پر سخت تہدید کی، اسے زندہ رہنے کا حق دیا اور کہا کہ جو شخص اس کے اس حق پر دست درازی کرے گا قیامت کے روز اسے خدا کو جواب دینا ہوگا۔ فرمایا:۔

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ اس وقت کو یاد کرو جب کہ اس لڑکی

بِأَيِّ ذَنۢبٍ قُتِلَتۡ	سے پوچھا جائے گا جسے زندہ دفن کیا گیا
(التکویر: ۸-۹)	تھا کہ کس جرم میں اسے مارا گیا۔

ایک طرف معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کے ساتھ اس ظلم و زیادتی پر جہنم کی وعید سنائی گئی تو دوسری طرف ان لوگوں کو جنت کی خوشخبری دی گئی جن کا دامن اس ظلم سے پاک ہو جو لڑکیوں کے ساتھ وہی سلوک کریں جو لڑکوں کے ساتھ کرتے ہیں اور دونوں میں کسی قسم کا فرق نہ کریں چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

من كانت له انثى فلم	جس شخص کے لڑکی ہو۔ وہ نہ تو اسے
يئدها ولم يهنها	زندہ درگور کرے اور نہ اس کے ساتھ تحقیر
ولم يؤثر ولده عليها	آمیز سلوک کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے
يعني الذكور ادخله	کو ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت
الله الجنة [1]	میں داخل فرمائے گا۔

ان اخلاقی تعلیمات کے ساتھ اسلام نے مرد کی طرح عورت کی زندگی کے بھی احترام کی تعلیم دی اور اس پر کسی قسم کی زیادتی ہو تو "قصاص" کا اسے حق دیا۔ قصاص کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ زیادتی ہو تو اسی کے برابر اسے بدلہ لینے کا حق ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے وارث اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ یہ قانون عورت اور مرد دونوں کے لیے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

وَكَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيهَآ أَنَّ	تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا
ٱلنَّفۡسَ بِٱلنَّفۡسِ وَٱلۡعَيۡنَ	تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے
بِٱلۡعَيۡنِ وَٱلۡأَنفَ بِٱلۡأَنفِ	آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے
وَٱلۡأُذُنَ بِٱلۡأُذُنِ وَٱلسِّنَّ	کان، دانت کے بدلے دانت، اور زخموں
بِٱلسِّنِّ وَٱلۡجُرُوحَ قِصَاصٞ	کا بدلہ ان کے برابر ہے جس نے قصاص کو

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فضل من عال یتامیٰ

فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ معاف کردیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔
وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ:۴۵) مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

تورات کے اس قانون کو اسلام نے زندہ کیا اور وہ اسلامی شریعت کا ایک جزو بن گیا۔ اس قانون نے عورت ہی پر نہیں بلکہ ہر کمزور فرد اور طبقہ پر ہونے والے ظلم کو روکا اور اسے انصاف دلایا۔[1]

پرورش کا حق

اسلام کے نزدیک ہر بچہ یہ اخلاقی اور قانونی حق لے کر پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ضروریات زندگی فراہم کی جائیں اور اسے موت کے منہ میں جانے نہ دیا جائے۔ بچہ کی پرورش اور دیکھ بھال ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل ہے۔ بالعموم لڑکے کی پرورش جس محبت، توجہ اور خوش دلی سے ہوتی ہے لڑکی کی نہیں ہوتی۔ اسلام نے اس فرق کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا۔ لڑکی کی پرورش کی خاص ترغیب دی اور اسے بہت بڑا کارِ ثواب بتایا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من بلی من هٰذه البنات اللہ تعالیٰ جس شخص کو ان لڑکیوں کے ذریعہ
شیئا فاحسن الیھن کن کچھ بھی آزمائش میں ڈالے اور وہ ان کے ساتھ
له سترا من النار[2] اچھا سلوک کرے تو وہ اس کے لیے جہنم سے
بچاؤ کا ذریعہ ہوں گی۔

اس حدیث میں لڑکیوں کے ساتھ احسان کا ذکر ہے۔ یہ ایک جامع لفظ ہے۔ اس میں ان کی پرورش۔ تعلیم و تربیت۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور محبت کا رویہ سب کچھ آجاتا ہے

---

[1] عورت کے قصاص اور دیت کے موضوع پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

[2] بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ۔ مسلم، ابواب البر والصلۃ، باب فضل الاحسان الی البنات

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من عال جاریتین	جو شخص دو بچیوں کی ان کے جوانی کو پہونچنے
حتی تبلغا جاء یوم	تک پرورش کرے گا قیامت کے روز میں اور
القیامۃ انا وھو وضم	وہ اس طرح ہوں گے یہ کہہ کر آپ نے انگشتہائے
اصابعہ [1]	مبارک کو ملایا۔

اب اس کی قانونی حیثیت دیکھئے۔ شریعت کی رو سے اولاد کے نان ونفقہ اور پرورش کی ذمہ داری قانوناً باپ پر عائد ہوتی ہے۔ اولاد میں لڑکے یا لڑکی کی تخصیص نہیں ہے۔ اس میں دونوں شامل ہیں۔ اس لئے لڑکا ہو یا لڑکی ان میں سے کسی کی بھی پرورش کی ذمہ داری سے وہ انکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ احکامِ رضاعت کے ذیل میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ	بچہ جس کا ہے (یعنی باپ) اس پر دودھ پلانے
بِالْمَعْرُوفِ (البقرۃ: ۲۳۳)	والی کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

اس سلسلہ میں فقہاء نے خاصی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ فقہاء احناف نے لکھا ہے کہ لڑکے کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے بالغ ہونے تک ہے۔ اس کے بعد باپ کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے۔ الّا یہ کہ وہ اپاہج یا معذور ہو۔ البتہ لڑکی کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے بالغ ہونے کے بعد بھی (شادی ہونے تک) باقی رہے گی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ بلوغ کے بعد یہ ذمہ داری باپ اور ماں کے درمیان تقسیم ہوجائے گی۔ باپ دو حصے برداشت کرے گا اور ماں ایک حصہ۔ اسی طرح جو بھی بالغ عورت محتاج ہے اس کا نان ونفقہ اس کے قریبی محرم پر واجب ہوگا البتہ ان میں سے اگر کوئی صاحب حیثیت ہے تو اسی کے مال میں سے اس پر خرچ کیا جائے گا کسی اور پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی [2]

تعلیم کا حق

انسان کی ترقی علم سے وابستہ ہے۔ جو فرد یا گروہ علم [illegible] ہے [illegible] وہ زندگی کی تگ ودو

---

[1] مسلم، ابواب البر والصلہ، باب فضل الاحسان الی البنات [illegible] ہدایہ ۲/ ۲۲۶ - ۲۲۷

میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ نہ تو اس کی فکری پرواز بلند ہو سکتی ہے اور نہ اس کی مادی ترقی ہی کا بہت زیادہ امکان ہے۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کا ایک طویل دور ایسا گزرا ہے جس میں عورت کے لئے علم کی اہمیت محسوس نہیں کی گئی۔ علم کا میدان صرف مرد کا سمجھا جاتا تھا۔ مردوں میں بھی خاص طبقات علم حاصل کرتے تھے، عورت علم کی بارگاہ سے بہت دور جہالت کی زندگی بسر کرتی تھی۔

اسلام نے علم کے دروازے عورت اور مرد دونوں کے لئے کھلے رکھے۔ اس راہ کی پابندیاں ختم کیں، اور ہر طرح کی آسانیاں فراہم کیں۔ اس نے خاص لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دلائی، اس کی ترغیب دی اور اسے کارِ ثواب بتایا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من عال ثلاث بنات	جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی۔ ان کو
فادّبهن وزوجهن	تعلیم و تربیت دی۔ ان کی شادی کی اور ان
واحسن اليهن فلہ الجنة[1]	کے ساتھ (بعد میں بھی) حسنِ سلوک کیا تو اس
	کے لئے جنت ہے۔

اسلام کا خطاب عورت اور مرد دونوں سے ہے۔ اس نے ان میں سے ہر ایک کو عبادات، اخلاق اور احکام شریعت کا پابند بنایا ہے۔ علم کے بغیر ان کی پابندی نہیں ہو سکتی۔ عورت کے لئے مرد سے تعلقات کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ یہ تعلقات انتہائی پیچیدہ اور بڑی نزاکت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں عورت کے حقوق بھی ہیں اور ذمہ داریاں بھی جب تک اسے ان کا علم نہ ہو وہ ٹھیک ٹھیک نہ تو اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتی ہے اور نہ اپنے حقوق کی حفاظت اس سے ہو سکتی ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ہی کے لئے کم از کم دین کی بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ عورت اگر ان سے ناواقف ہو تو شوہر اسے خود بتائے گا یا کوئی ایسا انتظام کرے گا کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔ اگر شوہر اس کا انتظام نہ کرے تو عورت خود سے انھیں سیکھنے کی کوشش کرے گی۔ یہ اس کا ایک قانونی حق ہے۔ اس کے لیے وہ گھر سے باہر بھی (اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ) جا سکتی

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتامیٰ

ہے۔ شوہر اس پر پابندی نہیں لگا سکتا۔[1]

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دورِ اوّل میں علم جس طرح مردوں میں پھیلا عورتوں میں بھی عام ہوا۔ صحابہ کے درمیان قرآن و حدیث کا علم رکھنے والی خواتین کافی تعداد میں ہمیں ملتی ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں مسائل کا استنباط اور فتویٰ دینا بڑا نازک اور مشکل کام ہے۔ اس میدان میں بھی عورتیں موجود تھیں۔ ان میں حضرت عائشہؓ، حضرت اُمِ سلمہؓ، اُمِ عطیہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، اسماء بنتِ ابوبکرؓ، اُمِ شریکؓ، فاطمہ بنتِ قیسؓ، خولہ بنتِ تویتؓ وغیرہ بہت نمایاں ہیں۔[2]

نکاح کا حق

عورت کو جس طرح زندگی کے اہم معاملات و مسائل میں بولنے کا حق نہیں تھا اسی طرح وہ اپنی شادی اور نکاح کے بارے میں بھی زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کے ماں باپ یا خاندان کے بزرگ جس شخص کے ساتھ اس کا رشتہ کر دیتے اس سے انکار کی اسے مجال نہ تھی۔ اس معاملہ میں اس کا زبان کھولنا سخت ناپسندیدہ اور معیوب سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی اسے طرح طرح کے معنیٰ پہنانے لگتی تھی۔ اپنے رشتہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا اور اپنے بڑوں کے منتخب کردہ رشتہ کو رد کرنا آوارگی کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ لڑکی کو نکاح کا اختیار دے دینا خود اس کے مفاد کے خلاف ہے۔ وہ اپنی کم سمجھی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے غلط فیصلہ کر سکتی ہے۔ لڑکی کے ماں باپ یا اس کے سرپرست اس سے زیادہ تجربہ کار اور معاملہ فہم ہوتے ہیں اس لئے ان سے غلطی کا امکان کم ہے۔ اس کے ساتھ وہ لڑکی کے خیر خواہ ہوتے ہیں وہ بہرحال اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ لڑکی کے سرپرست اس کے لئے بہتر رشتہ تلاش کر سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات سرپرستوں کی طرف سے زیادتی بھی ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل کا ذریعہ بھی بنا بیٹھتے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھی جائے۔ راقم کی کتاب "عورت ــــ اسلامی معاشرے میں"

[2] ملاحظہ ہو: اعلام الموقعین ۱ ۹ ــ ۱۱

ہیں۔ کم از کم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بسا اوقات سرپرست کے سامنے وہ معیارات نہیں ہوتے جنھیں خود لڑکی اہمیت دیتی ہے۔ اس لئے لڑکی کے نکاح کا اختیار بالکلیہ اس کے سرپرست کو دے دینا صحیح نہیں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی عورت اور مرد کا رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا ان کے لیے بڑا اہم واقعہ ہے۔ اس سے دونوں ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ اس لئے یہ رشتہ ان کی باہم رضامندی سے ہونا چاہیے۔ یہ بات معقول نہ ہوگی کہ عورت پر اس کی مرضی کے خلاف نکاح کا فیصلہ مسلط کر دیا جائے۔

اسلام نے نکاح کے معاملہ میں لڑکی کے ولی اور سرپرست کو اہمیت ضرور دی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ نکاح اس کی اجازت سے ہوگا۔ اگر عورت بیوہ یا مطلقہ ہے تو صراحت سے اپنی رضامندی کا اظہار کرے گی اور باکرہ ہے تو اس کی خاموشی کو اس کا اتفاق سمجھا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لا تنکح الایم حتی تستأمر ولا تنکح البکر حتی تستاذن	بیوہ یا مطلقہ کا نکاح نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کی رائے نہ معلوم کر لی جائے۔ دوشیزہ کا نکاح نہیں ہوگا جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے۔

صحابہ نے عرض کیا باکرہ تو شرم و حیا کی وجہ سے بولے گی نہیں اس سے اجازت کیسے لی جائے؟ آپ نے فرمایا اس کا سکوت ہی اس کی اجازت ہے[1]

اگر کسی عورت کا ولی اس کا نکاح کر دے اور وہ اسے تسلیم نہ کرے تو نکاح کالعدم سمجھا جائے گا۔ چنانچہ خنساء بنت خذام کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف ان کے باپ نے کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکاح ختم کرا دیا[2]۔

اس سلسلہ کے اور بھی واقعات حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا ولی اور سرپرست کر سکتا ہے لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ بلوغ کے بعد اسے اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو

---

[1] بخاری، کتاب النکاح۔ باب لا ینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الا برضاہا۔ مسلم، کتاب النکاح۔

[2] بخاری، کتاب النکاح۔ باب اذا زوج ابنتہ وہی کارہۃ

اسے قبول کرے یا نہ کرے

مہر کا حق

اسلام نے مرد کو حکم دیا ہے کہ جس عورت سے اس کا نکاح ہو اسے لازماً مہر ادا کرے۔ مہر کے بغیر نکاح اس کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ نکاح میں عورت کو مہر دینے کا تصور اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں بھی تھا لیکن اہل عرب نے عملاً اسے اس سے محروم کر رکھا تھا۔ اس کی مختلف شکلیں تھیں۔

۱۔ عورت کا سرپرست اس کے مہر کو اپنی ملکیت سمجھتا اور جو مہر ملتا اس پر قبضہ کر لیتا۔ وہ یوں تو لڑکی کو باعث عار سمجھتے تھے اور اس کی پیدائش سے ان پر غم واندوہ کے بادل چھا جاتے تھے لیکن اس پہلو سے وہ ان کے لیے ایک طرح سے خوشی کا سبب بھی تھی کہ اس کے مہر سے ان کی دولت میں اضافہ ہوگا۔ چنانچہ وہ لڑکی کو "النافجہ" (اضافہ کرنے والی) کہتے تھے۔ اور اس کی پیدائش پر ان الفاظ میں مبارک باد دی جاتی تھی: ھنیئاً لك النافجه' (مبارک ہو تمہارے لیے دولت بڑھانے والی) مہر میں چونکہ وہ اونٹ لیتے تھے اس کا مطلب یہ ہوتا کہ لڑکی کی جب شادی ہوگی تو اس کے مہر میں جو اونٹ ملیں گے اس سے تم اپنے اونٹوں کی تعداد بڑھاؤ گے۔[1]

۲۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی آدمی مرجاتا اور اس کی بیوی موجود ہوتی تو اس کی دوسری بیوی کا لڑکا یا کوئی رشتہ دار ایک چادر اس عورت پر یہ کہہ کر ڈال دیتا کہ مرنے والے کے مال کی طرح میں اس عورت کا بھی وارث ہوں۔ اس سے اس عورت پر اس کا حق مسلم ہو جاتا۔ نہ تو کوئی دوسرا اس کا دعویٰ کر سکتا تھا اور نہ خود عورت اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تو قدیم مہر ہی کی بنیاد پر اس سے شادی کر لیتا اگر کسی دوسرے شخص سے اس کا نکاح کرتا تو اس کے مہر پر قبضہ کر لیتا اور اسے بالکلیہ اس سے محروم کر دیتا۔[2]

۳۔ کبھی اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے کم مہر بھی دیا جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، مادہ ن ف ج۔ تفسیر کبیر: ۱۴۴/۲۰۔ [2] تفسیر کبیر: ۱۷۹/۳۔

فرماتی ہیں: کوئی یتیم لڑکی کسی کی سرپرستی میں ہوتی اور وہ اس کی خوبصورتی اور مال و دولت کی وجہ سے خود اس سے نکاح کرنا چاہتا تو کسی دوسرے سے اس کا نکاح نہیں کرتا تھا بلکہ خود نکاح کر لیتا اور اسے اتنا مہر نہیں دیتا جتنا کہ دوسرا شخص اسے دینے کے لیے تیار ہوتا۔ قرآن نے اس سے منع کیا اور کہا کہ اگر ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ شادی کرنا چاہو تو انہیں پورا مہر دو۔ ورنہ کسی دوسری عورت سے شادی کر لو[1]۔

۴۔ دورِ جاہلیت میں عورت کا مہر ختم کرنے کی ایک صورت وہ بھی تھی جسے حدیث میں شغار کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنی لڑکی کا نکاح کسی سے اس شرط کے ساتھ کرے کہ وہ اس کے عوض اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دے دے اور اس ادلا بدلے کی شادی میں دونوں لڑکیوں میں سے کسی کا مہر نہ ہو۔

اسلام نے جاہلیت کے اس طریقہ کو ختم کر دیا۔ حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

نہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن الشغار[2] — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شغار سے منع فرمایا ہے۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:-

لا شغار فی الاسلام[3] — اسلام میں شغار نہیں ہے۔

بخاری کی روایت میں بغیر مہر کے بیٹیوں کے تبادلہ کا ذکر ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں بہنوں کے بھی تبادلے کا ذکر ہے۔ یہ دونوں مثالیں ہیں ورنہ جیسا کہ امام نووی نے فرمایا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ان کے علاوہ بھتیجیوں، پھوپھیوں اور چچا زاد بہنوں وغیرہ کا تبادلہ بھی اسی ممانعت میں آتا ہے[4] علماء کا اس پر تو اجماع ہے کہ جاہلیت کے اس طریقے

---

[1] بخاری کتاب التفسیر: سورہ النساء باب وان خفتم ان لا تقسطوا الایہ
[2] بخاری: کتاب النکاح باب الشغار، مسلم: کتاب النکاح باب تحریم نکاح الشغار و بطلانہ
[3] مسلم کتاب و باب مذکور۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شغار کی مذکورہ بالا تشریح رسول اللہ صلعم نے خود فرمائی لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے زیادہ قوی نہیں ہے زیادہ تر روایتوں میں یہ تشریح حضرت عبد اللہ بن عمر اور ان کے شاگرد نافع سے مروی ہے یہی ایک مستند تشریح ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری ۹/ ۱۲۸ [4] شرح مسلم ۱/ ۴۵۵-۴۵۶

کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اس طرح کا نکاح ہو جائے تو باطل ہوگا یا نہیں۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کے صاحبزادے عباس نے اپنی لڑکی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے اور عبدالرحمٰن بن حکم نے اپنی لڑکی کا نکاح عباس سے کر دیا اور اس ادلا بدلی کو دونوں کا مہر قرار دے دیا۔ حضرت معاویہؓ کو جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے گورنر مدینہ مروان کو لکھا کہ ان کے درمیان تفریق کر دی جائے اس لیے کہ یہی وہ شغار ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔[1]

امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد وغیرہ کے نزدیک یہ نکاح باطل ہے۔ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ نکاح تو صحیح ہے البتہ دونوں کا مہر مثل واجب ہوگا۔ ان کے نزدیک اس میں خرابی محض مہر کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ خرابی مہر مثل سے دور ہو جاتی ہے۔[2]

اس طرح اسلام نے مہر کو بلا شرکت غیرے تنہا عورت کا حق قرار دیا اور اس حق پر ہونے والی تمام زیادتیوں کو ایک ایک کر کے ختم کیا۔ اس نے صاف لفظوں میں حکم دیا۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۔ عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو۔ (النساء: ۴)

علامہ ابوبکر جصاص اس کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

ان المھر لھا وھی المستحقۃ لہ، لاحق للولی فیہ[3] ۔ مہر اس کی ملکیت ہے، وہی اس کی مستحق ہے۔ اس کے سرپرست کا اس میں کوئی حق نہیں۔

شریعت نے مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ یہ آدمی کی حیثیت کے مطابق کم یا زیادہ ہو سکتا ہے البتہ اس کا رجحان یہ ضرور ہے کہ مہر اتنا ہونا چاہیے کہ آدمی اسے آسانی سے ادا کر سکے۔ فقہاء کے درمیان مہر کی کم از کم مقدار کے تعین میں اختلاف ہے۔ فقہاء احناف کے نزدیک اسے دس درہم سے کم نہیں ہونا چاہیے۔[4]

---

[1] ابوداؤد: کتاب النکاح، باب فی الشغار، [2] معالم السنن: ۳/۹۲، شرح مسلم للنووی: ۱/۴۵۲

[3] احکام القرآن: ۲/۶۹ [4] مہر کے مسئلہ پر بحث آگے آرہی ہے

نان ونفقہ کا حق

شادی سے پہلے لڑکی کی پرورش کی ذمہ داری باپ کی ہے۔ شادی کے بعد اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوجاتی ہے۔ شریعت کی رو سے بیوی امیر ہو یا غریب اس کا نان ونفقہ شوہر پر واجب ہے۔ فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ میاں بیوی دونوں صاحبِ حیثیت ہوں تو بیوی کا نفقہ اسی کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ بیوی غریب اور شوہر مالدار ہو تو اس کا نفقہ غریب اور امیر کے نفقہ کے درمیان یعنی غریب کے نفقہ سے زیادہ اور امیر کے نفقہ سے کم ہوگا لیکن اگر بیوی مالدار اور شوہر غریب ہے تو مرد اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے گا اور باقی اس کے ذمہ قرض ہوگا جسے وہ حسبِ سہولت ادا کرے گا۔

عورت اگر صاحبِ حیثیت ہے تو اس کے لیے خادم بھی فراہم کیا جائے گا۔ بیوی شوہر کے رشتہ داروں کے ساتھ مل کر رہنا نہ چاہے تو وہ الگ مکان کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ یہ اس کا قانونی حق ہے اور شوہر کے لیے اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔

اس ذیل میں یہ بیان کردینا بھی مناسب ہی ہوگا کہ شوہر کی خدمت اور گھر کا کام کاج فقہ حنفی کے مطابق عورت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ یہ سب کچھ کرتی ہے تو یہ اس کا اخلاق اور حسنِ سلوک ہے۔ اس پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔[1]

کاروبار اور عمل کی آزادی کا حق

اسلام نے عورت کو کاروبار اور پیشہ وعمل کی آزادی دی ہے۔ اس کے لیے تجارت، زراعت، لین دین، صنعت وحرفت، ملازمت، درس وتدریس، صحافت وتصنیف سب ہی جائز کاموں کی اجازت ہے۔ اس کے لئے وہ گھر سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ البتہ اس پر وہ بعض پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ان پابندیوں کے دو مقاصد ہیں۔ ایک یہ کہ خاندان کے نظام میں کوئی خلل اور انتشار نہ پیدا ہو اور اس کے استحکام میں فرق نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ عورت باعفت زندگی گزار سکے اور اسے ایسے حالات

---

[1] یہ تفصیلات فقہ حنفی کی بیان کی گئی ہیں۔ ہدایہ ۲/ ۴۱۰ - ۴۱۹۔ دوسری فقہوں میں بعض جزئیات میں تھوڑا بہت اختلاف ہے۔

میں نہ ڈالا جائے کہ اس کے لئے اخلاقی حدود میں قائم رہنا دشوار ہو جائے۔[1]

مال و جائداد کا حق

دنیا کی بہت سی قومیں وہ تھیں جن میں عورت کو حق ملکیت حاصل نہ تھا۔ اس کا خاندان کی جائیداد میں کوئی حصہ نہ تھا بلکہ وہ اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرتی اسے بھی باپ، بیٹے، شوہر یا خاندان کے دوسرے افراد کی ملکیت سمجھا جاتا۔ اسلام نے عورت کے حق ملکیت کو تسلیم کیا اور اس میں مداخلت کو غلط اور ناجائز ٹھہرایا۔ اس کے نزدیک جائز ذرائع سے حاصل شدہ دولت پر جس طرح مرد کو حق ملکیت حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی حاصل ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا — جو کچھ مردوں نے کمایا اس کے مطابق ان کا

وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ — حصہ ہے اور جو عورتوں نے کمایا اس کے مطابق

(النساء: ۳۲) — ان کا حصہ ہے۔

عورت کو شرعی ضابطہ کے تحت ماں باپ، شوہر یا اولاد وغیرہ سے جو مال اور جائیداد ملے یا وہ اپنی سعی و جہد سے جو دولت حاصل کرے اس کی وہ خود مالک ہے اس میں تصرف کا اسے پورا حق حاصل ہے۔ وہ اسے اپنی آزاد مرضی سے اپنی ذات پر، شوہر اور بچوں پر، والدین اور خاندان کے دوسرے افراد پر خرچ کر سکتی ہے۔ نیک کاموں میں اسے لگا سکتی ہے۔ وہ جائداد کی خرید و فروخت اور وقف، ہبہ اور وصیت کا حق رکھتی ہے۔ اس میں مداخلت کا کوئی بھی شخص مجاز نہیں ہے۔

عزت و آبرو کا حق

عزت و آبرو انسان کی بڑی قیمتی متاع ہے۔ اس سے کھیلنے اور اس پر دست درازی کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ عورت کی عزت و آبرو پر ہمیشہ حملے ہوتے رہے ہیں اور وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کی حفاظت میں بہت زیادہ کامیاب بھی نہیں رہی ہے۔ اس پر حملے کی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کی بحث "عورت کا معاشی مسئلہ"

دو شکلیں ہیں۔ ایک قذف اور دوسرے زنا۔ قذف یہ کہ اس کے دامنِ عفت پر چھینٹے پھینکے جائیں اور اس پر بدچلنی اور بدکاری کا الزام لگایا جائے۔ اسلام کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم اور گناہِ کبیرہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو ہلاک کر دینے والے سات گناہوں میں ایک کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

قذف المحصنات المؤمنات	پاک دامن ایمان والی اور بھولی بھالی عورتوں
الغافلات [1]	پر بدکاری کی تہمت لگانا۔

اسلام نے قانونی طور پر یہ سخت اقدام کیا کہ جو شخص کسی عورت پر بدکاری کی تہمت باندھے اسے اسّی کوڑے لگائے جائیں اور کسی معاملہ میں اس کی شہادت نہ قبول کی جائے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ	جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور
لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ	ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی کوڑے
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً	لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو وہ خود
وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ	ہی فاسق ہیں سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ	کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں۔
بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ	اللہ ضرور ان کے حق میں غفور رحیم ہے۔
رَّحِيْمٌ ۝ (النور: ۴، ۵)	

اب زنا اور آبرو ریزی کے مسئلہ کو لیجئے۔ اسلامی قانون کے تحت کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ زبردستی زنا کرے تو اسے اگر وہ بے شادی شدہ ہے تو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ ہے تو رجم کیا جائے گا۔ ہاں اگر عورت زنا میں بخوشی شریک ہو تو وہ بھی اسی سزا کی مستحق ہوگی [2]

---

[1] مشکوٰۃ، باب الکبائر وعلامات النفاق بحوالہ بخاری و مسلم

[2] ان مسائل کی تفصیلات قرآن، حدیث اور فقہ میں مل سکتی ہیں۔

تنقید واحتساب کا حق

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے عورت کو بعض اجتماعی اور سیاسی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کر رکھا ہے (اس پر ہم الگ سے بحث کریں گے) لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان معاملات سے بالکل الگ تھلگ اور کنارہ کش رہے گی اور اسے اجتماعی نفع ونقصان سے کسی قسم کی دلچسپی نہ ہوگی۔ قرآن مجید نے عورت اور مرد دونوں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ	مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک دوسرے
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	کے رفیق ہیں معروف کا حکم دیتے اور منکر سے
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ: ۷۱)	روکتے ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بڑے وسیع تقاضے ہیں۔ اس میں دعوت وتبلیغ بھی داخل ہے۔ یہ امت کی اصلاح کا عمل بھی ہے اور حکومت پر تنقید اور احتساب بھی اس میں آتا ہے۔ عورت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حدود میں رہتے ہوئے یہ تمام تقاضے پورے کرے۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ دور اول کی خواتین اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتی تھیں اور اسے پورا کرنے کی کوشش بھی کرتی تھیں۔

اعتراضات کا
جائزہ

ایک عمومی تبصرہ

عورت کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ یہ موجودہ دور کا ایک بہت ہی پیچیدہ اور نازک سوال ہے۔ اس پر اتنی بحثیں ہو چکی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں کہ ان سب کو جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ ایک چھوٹی سی لائبریری تیار ہو سکتی ہے لیکن ان بحثوں سے یہ سوال حل نہیں ہوا۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ ان بحثوں سے اس سوال کی پیچیدگی اور نزاکت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس سوال کے جواب میں اسلام کا بھی ایک موقف ہے۔ یہ موقف دورِ جدید کے زیر اثر نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ موقف پہلے روز سے ہے۔ کل بھی تھا، آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ اس کا یہ موقف اُس موقف کے بالکل خلاف تھا جو صدیوں سے تسلیم شدہ تھا اور جس پر ساری دنیا میں عمل ہو رہا تھا۔ اس میں عورت کی عمر اور مرد سے اس کے تعلق کی نوعیت کے لحاظ سے محبت ہے، ہمدردی اور تعاون ہے، مساوات ہے، اس کی مستقل شخصیت کا اعتراف ہے، اس کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہے، اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حقوق ہیں اس کے ساتھ اس کی طاقت اور صلاحیت کے لحاظ سے ذمہ داریاں بھی ہیں، یوں کہنا چاہئے کہ اس میں اس کی شخصیت کی تکمیل کا بھرپور سامان ہے۔ یہ بہت ہی واضح، مدلّل اور مضبوط موقف ہے۔ اس سے وہ پیچیدگیاں بھی حل ہو جاتی ہیں جو موجودہ دور کے موقف نے سماجی زندگی میں پیدا کر دی ہیں۔

اسلام کے بارے میں بعض لوگوں کا رویہ غیر علمی اور جانبدارانہ ہوتا ہے، وہ اپنے مخصوص مذہبی اور سیاسی نظریات کی وجہ سے اسلام کی کسی خوبی کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ یہ لوگ عورت کے سلسلے میں اسلام کے مثبت کردار کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تعصب اور تنگ نظری بڑا مہلک مرض ہے جو شخص اس مرض میں مبتلا ہو وہ بڑی بڑی حقیقتوں کو دیکھ

نہیں پاتا اور دیکھ لیتا ہے تو ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن حقیقتیں چھپائی نہیں جاسکتیں، وہ دیر سویر اپنا وجود منوا ہی لیتی ہیں۔ جب تک روئے زمین پر قرآن مجید اور حدیث کی واضح تعلیمات اور اسلام کی وہ فقہی اور قانونی بحثیں موجود ہیں جن کے مطابق صدیوں تک پوری اسلامی دنیا میں فیصلے اور ان پر عملدرآمد ہوتا رہا، عورت پر اسلام کے احسانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام سے پہلے عورت کی جو ناگفتہ بہ حالت تھی، اسلام نے اس کی ضرور اصلاح کی اور اسے بعض وہ حقوق دیے جن سے وہ پہلے محروم تھی، لیکن عورت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔ اس نے مرد کو جو حقوق دئیے وہ حقوق عورت کو نہیں دئیے اور دونوں کے درمیان بہت سے معاملات میں فرق و امتیاز باقی رکھا۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے مرد اور عورت کو ایک حیثیت نہیں دی اور ان میں پوری طرح مساوات نہیں قائم کی۔[1]

اسلام نے عورت کو جو حقوق دئیے ہیں ان پر عدم مساوات کے اس نقطۂ نظر سے بہت سے اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مرد کی برتری کا تصور ہے۔ مرد گھر کا حاکم اور نگراں ہے، وہ ایک سے زیادہ شادیاں کرسکتا ہے۔ اسے طلاق کا حق حاصل ہے، وراثت میں عورت کا حصہ آدھا ہے، شہادت، قصاص اور دیت کے قانون میں اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ یہ اور اس طرح کے اور بھی اعتراضات ہیں۔ اعتراض کرنے والے چاہتے ہیں کہ ان قوانین کو بدل دیا جائے۔ مرد کی برتری ختم کردی جائے، عورت

---

[1] ہمارے ملک میں مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ایک زندہ مسئلہ ہے، پوری امت اس کے لیے فکرمند ہے اور اس کے بقاء و تحفظ کی کوشش کر رہی ہے۔ پرسنل لا کا تعلق گو بہت سے شخصی و سماجی احکام سے ہے۔ اور اس میں مرد کے بعض حقوق بھی شامل ہیں لیکن جس مسئلہ نے اس وقت اہمیت اختیار کرلی ہے وہ عورت کے حقوق کا مسئلہ ہے۔ مخالفین کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحت عورت کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے اور اسے پورے حقوق حاصل نہیں ہیں چنانچہ قدم قدم پر عورت کی مظلومی کی دہائی دی جاتی ہے اور پرسنل لا میں ترمیم اور تبدیلی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

کو خانگی زندگی میں وہ سارے حقوق دیے جائیں جو مرد کو حاصل ہیں، دونوں کو برابر کے اختیارات ہوں، وراثت میں عورت کا حصہ وہی رہے جو مرد کا ہے، طلاق کا حق عورت کو بھی حاصل ہو، وہ جب چاہے مرد سے علیحدگی حاصل کر سکے، مرد طلاق دے تو مطلقہ کی زندگی بھر اس کا نفقہ برداشت کرے، مرد کو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی اجازت نہ ہو۔ بعض اوقات یہ کہنے میں بھی تامل نہیں ہوتا کہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہو تو عورت کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ ایک سے زیادہ مردوں سے تعلق رکھے۔ عورت کو وہ تمام سیاسی و سماجی حقوق دئے جائیں جو مرد کو حاصل ہیں یہ سارے اعتراضات اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ افسوس ہے کہ اس ناواقفیت میں بہت سے پڑھے لکھے لوگ اور دانش ور بھی گرفتار ہیں۔ اسلام نے زندگی کا جو وسیع اور جامع تصور دیا ہے اور جس طرح شخصی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کی ہے اس کی روشنی میں یہ اعتراضات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔

یہ اعتراضات نئے بالکل نہیں ہیں۔ ان کی عمر کافی ہو چکی ہے۔ اس مدت میں مختلف پہلوؤں سے ان کے جوابات بھی دئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن یہ بات کس قدر افسوسناک اور علمی دیانت کے خلاف ہے کہ ان اعتراضات کو اس طرح دہرایا جاتا ہے کہ جیسے پہلی بار انھیں دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اور ان کا کوئی جواب مسلمان مفکرین کے پاس نہیں ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کے پیچھے اسلام کو سمجھنے کا جذبہ کم ہے اور زیادہ دل چسپی اسے ہدف تنقید بنانے سے ہے، حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ جن اعتراضات کا جواب دیا جائے اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اس میں کوئی خامی ہو تو اسے واضح کیا جائے۔ اس سے افہام و تفہیم کی راہیں کھلیں گی، غلط فہمیاں رفع ہوں گی اور اسلام کو صحیح شکل میں سمجھا جا سکے گا۔

یہ سارے اعتراضات وہ لوگ کرتے ہیں جن کے ذہنوں پر مساواتِ مرد و زن کا وہ غیر معتدل نظریہ چھایا ہوا ہے جسے مغرب نے پیش کیا ہے اور جس کے جنگل میں خود بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ یہ نظریہ اب محض نظریہ نہیں رہا بلکہ اس کا طویل تجربہ ہو چکا ہے اور

جنسی آوارگی اور خاندان کی بربادی کی شکل میں اس کے بھیانک نتائج سامنے آچکے ہوں،[1] لیکن ان نتائج سے صرف نظر کر کے اس کی وکالت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک بے ضرر نظریہ ہے بلکہ عورت کی نجات اور کامیابی اسی سے وابستہ ہے۔ اگر اسلام اس کا ساتھ نہ دے تو عقل کا تقاضا ہے کہ اسے خیرباد کہہ دیا جائے۔ حالانکہ تاریخ کا تجربہ، عورت کے بارے میں اسلام کے نظریہ کی قدروقیمت، افادیت اور پاکیزگی واضح کر چکا ہے۔ جب بھی مغرب کے مساواتِ مردوزن کے تصور کی اصلاح کی جائے گی اور اس کی بے اعتدالیوں کو دور کیا جائے گا وہ اسلام کے نظریہ سے قریب ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسلام ہی کے ذریعہ اس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور اس کی خامیاں دور کی جاسکتی ہیں۔

عورت کے بارے میں اسلام کے موقف پر اس کے مخالفین کی طرف سے اعتراضات اتنی شدت کے ساتھ ہوتے رہے ہیں اور مسلسل ہو رہے ہیں کہ بہت سے اسلام کا نام لینے والے بھی ان سے متاثر اور مرعوب ہیں۔ اور انھیں اسلام کی تعلیمات میں بڑی خامیاں نظر آتی ہیں۔

اس مرعوبیت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ ان سب کا تعین آسان نہیں ہے۔ بعض حضرات، چاہے وہ زبان سے اس کا اقرار کریں یا نہ کریں لیکن عملاً اسلام کے ان 'فرسودہ' اور ناقابلِ عمل قوانین ہی سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک آج کے دور میں عورت کی منزل اسلام نے نہیں مغرب نے متعین کی ہے۔ وہ اسلام کے "حصار" میں رہ کر ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے اسے ان مرغزاروں میں دوڑ لگانی ہوگی جو مغرب کی رہنمائی میں تیار ہوئے ہیں، ان کی اس خواہش اور کوشش کا ایک مسلمان اس وقت تک ساتھ نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ مسلمان ہے۔ اس کے لیے احکامِ شریعت وہ 'حدود' ہیں جن سے تجاوز کی اسے اجازت نہیں ہے۔ اگر کبھی اس سے یہ غلطی سرزد ہو جائے

---

[1] اس کی تفصیل 'آزادیٔ نسواں کا مغربی تصور' کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔

تو وہ اپنے آپ کو مجرم اور خدا کے سامنے جواب دہ تصور کرے گا اور جلد سے جلد ان حدود کے اندر کے آنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس وقت تمام احکام شریعت زیر بحث نہیں ہیں۔ صرف ان احکام کا ذکر ہے جو خاندانی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان احکام کو قرآن مجید نے متعدد مقامات پر 'حدود اللہ' سے تعبیر کیا ہے اور ان حدود کو توڑنے سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ایک جگہ قانون طلاق کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔

تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا	یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں۔ ان سے
وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ	آگے نہ بڑھو جو لوگ ان سے آگے بڑھیں
هُمُ الظّٰلِمُونَ ٥ (البقرہ : ۲۲۹)	وہی ظالم ہیں۔

سورۂ طلاق میں بھی احکام طلاق بیان ہوئے ہیں۔ اس کے فوراً بعد ارشاد ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ	کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب
اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا	کی اور اس کے رسولوں کے حکم کی نافرمانی
شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا	کی تو ہم نے ان سے سخت حساب لیا اور
نُّكْرًا ٥ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا	انھیں بری طرح عذاب دیا۔ انھوں نے
وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ٥	اپنے اعمال کا مزا چکھا اور ان کا انجام کار نقصان
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا	ہوا۔ اللہ نے آخرت میں ان کے لیے سخت
فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ	عذاب تیار کر رکھا ہے۔ لہٰذا اے عقل والو،
اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ	جو ایمان لائے ہو۔ اللہ سے ڈرو بے شک
ذِكْرًا ٥ (الطلاق : ۸-۱۰)	اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے۔

اس تہدید کے بعد کیا کوئی مسلمان عورت کے حقوق یا عائلی قوانین یا کسی بھی قانون شریعت کی مخالفت کا تصور کر سکتا ہے ؟

بعض حضرات کے دل و دماغ پر مغرب کا اتنا غلبہ تو نہیں ہے کہ وہ قرآنی احکام کو دفتر پارینہ سمجھ کر رد کر دیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی شریعت جن حالات میں نازل ہوئی تھی وہ حالات بدل چکے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں صدیوں پرانے اصول و روایات پر اصرار

صحیح نہیں ہے۔ یہ دور مسابقت کا دور ہے۔ اسلام نے عورت کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے اس پر قائم رہتے ہوئے موجودہ مسابقت میں وہ شریک نہیں ہوسکتی۔ اس کے پیچھے رہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ پوری قوم پیچھے رہ جائے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی قوانین میں ترمیم کرکے انھیں موجودہ دور سے ہم آہنگ کرلیا جائے۔ ان حضرات کے نزدیک یہ 'اجتہاد' ہے اور بدلے ہوئے حالات میں اجتہاد ضروری ہے۔ جو لوگ اس طرح کا 'اجتہاد' نہیں کرتے انھیں آئے دن ان حضرات کی طرف سے حالات سے بے خبر اور جمود زدہ ہونے کے طعنے سننے پڑتے ہیں۔

بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھ کر بڑی سادگی اور بھولے پن سے کہتے ہیں کہ اسلام ایک جدید (MODREN) مذہب ہے۔ اس نے عورت کو دورِ جدید کے سارے حقوق دیے ہیں۔ لیکن قدامت پرستوں نے قرآن و حدیث کی تعبیر اس طرح کی ہے کہ دورِ غلامی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس لیے اسلام کی جدید اور ترقی پسندانہ تعبیر کی ضرورت ہے کون ہے جو اس فہم و بصیرت اور روشن خیالی کی داد نہ دے؟

جو لوگ 'اجتہاد' کے نام پر اسلامی قانون میں ترمیم چاہتے ہیں وہ غالباً اسلامی قانون کو بھی انسانی قوانین پر قیاس کرتے ہیں۔ جو قانون انسان بناتا ہے اسے وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے بدل سکتا ہے۔ اسلامی قانون کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اس لیے اس میں کسی بھی فرد کو ترمیم و تبدیلی کا حق نہیں ہے۔ یہ حق اس نے اس پیغمبر کو بھی نہیں دیا جس پر شریعت کا نزول ہوا۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ	جب انھیں ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی
قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا	جاتی ہیں تو وہ لوگ جنھیں ہم سے ملاقات کی
ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ	توقع نہیں ہے، کہتے ہیں کہ اس کی جگہ کوئی
بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ	دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں ترمیم کردو۔ ان
أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ	سے کہہ دو کہ یہ میرا کام نہیں کہ میں اس میں اپنی
أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ	طرف سے کوئی ترمیم کردوں۔ میں تو اس وحی
إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ	کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے۔ اگر میں

عَظِیْمٍ ○ اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے
(یونس: ۱۵) دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانی قوانین وقت اور حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یہ زمان و مکان کے اثرات سے آزاد نہیں ہوتے۔ ان میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ وہ حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی قانون میں اس لچک کا نہ پایا جانا اس کی خوبی نہیں خامی ہے جو اسے بدلے ہوئے حالات میں ناقابل عمل بنا دیتی ہے۔ لیکن جس شخص نے بھی اسلام کا کھلے ذہن سے تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ قرآن نے خود کو ایک ابدی دین کی حیثیت سے پیش کیا ہے جس میں تاقیامت کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اجتہاد ایک دوسری ہی چیز ہے۔ وہ قرآن کے صریح احکام کو بدل دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ان احکام کی روشنی میں مزید نئے احکام وضع کرنے کا نام ہے۔ یہ کام بے قید اور آزاد فکر کے ساتھ نہیں ہو سکتا بلکہ اسے بعض سخت حدود کا پابند ہونا پڑے گا۔

یہاں ایک سوال بار بار ذہن میں ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ آخر ان مصلحین (REFORMISTS) کو عورت کے حقوق اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی فکر اس قدر دامن گیر کیوں ہے؟ مسلمانوں میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ عقیدے کی بھی، عمل کی بھی، اخلاق کی بھی، لین دین اور معاملات کی بھی۔ لیکن وہ مسلمان عورت کی مظلومی پر جس قدر فکرمند اور پریشان ہیں اتنے فکرمند اور پریشان کسی اور مسئلہ میں نظر نہیں آتے؟

ان حضرات کے ذہن و فکر کے مطالعہ سے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا مقصد اور اس کی منزل وہ ہے اور وہی ہونی چاہیے جو مغرب نے متعین کردی ہے۔ اس کے لیے راستہ بھی انھوں نے وہی اختیار کیا ہے جو مغرب نے اختیار کیا ہے۔ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دین و مذہب ایک بے معنی چیز ہے۔ اس کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کسی کو اس سے دلچسپی ہو تو اپنی شخصی زندگی میں اس سے دلچسپی رکھے، اجتماعی زندگی کو اس سے بہرحال آزاد ہونا چاہیے۔ جب تک انسان مذہب کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے، ماضی کے دورِ ظلمت میں پڑا رہے گا اور ترقی کی راہیں اس

کے لیے بند ہوں گی۔ آج کے دور میں اسے جینے کا حق نہیں ہے۔

یہ پوری مسلمان امت کو اسی راہ پر لے چلنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے قدم کے طور پر شاید وہ 'معاشرتی اصلاح' کو زیادہ سود مند خیال کرتے ہیں اور مسلمان عورت کے حقوق کی دہائی دے کر انھیں اس میدان میں کامیابی کی بھی غالباً زیادہ توقع ہے۔ اس لیے کہ جب تک مسلمان عورت دین کے قدیم تصورات کی 'دلدل' میں پھنسی ہوئی ہے اور نئی نسل کو خدا اور رسول کی وفاداری اور ان کے احکام کی اتباع کا درس دے رہی ہے، اس وقت تک دین کی بندشیں اتنی ڈھیلی نہیں ہوں گی کہ مسلمان امت کو ہزار بے عملی کے باوجود اس سے پھیرا جاسکے۔ ان کا رخ اسی وقت بدلے گا جب کہ عورت دین سے منھ پھیر لے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف علَم اٹھالے۔ اس میں چونکہ وہ کامیاب نہیں ہیں اور انھیں کامیابی کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے، اس لیے غم و غصہ مذہب کے علمبرداروں پر اتارتے رہتے ہیں اور انھیں دقیانوسی، قدامت پرست، احیاپسند اور بنیاد پرست جیسے القاب سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان کی زبان اور قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ سند ہے اور جدید پریس نے اسے وسیع پیمانے پر پھیلانے کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ ساری تہذیب و شائستگی بڑی بے تکلفی کے ساتھ پھیلتی رہتی ہے۔

بعض حضرات بذات خود دینی مزاج کے حامل ہیں اور مغربی تہذیب کے تلخ تجربات سے بچنا بھی چاہتے ہیں۔ لیکن چاروں طرف سے اس تہذیب کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ وہ اس کے اثرات سے آزاد نہیں ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی معاشرت میں تبدیلی آرہی ہے اور عملاً مغربی تہذیب کی گرفت ان پر مضبوط ہوتی جارہی ہے لیکن ابھی وہ اس پہلو سے خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں کہ مغرب کی تقلید کی دوڑ میں شریک ہونے کے باوجود اس کی خرابیوں سے ان کی معاشرت محفوظ ہے اور آئندہ بھی اسی طرح محفوظ رہے گی۔ لیکن یہ جھوٹا اطمینان ہے اور ایک طرح کی خوش فہمی ہے جو زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر ابھی تک مغرب کے کڑوے کسیلے پھل ان کے حلق سے نہیں اتر رہے ہیں تو اس کی وجہ اسلام کے وہ اثرات ہیں جو

تہذیب کے ثمرات کو ظاہر نہیں ہونے دے رہے ہیں۔ جب یہ اثرات ختم ہوں گے تو مغربی تہذیب اپنی تمام خرابیوں کے ساتھ ان کے گھروں میں موجود ہوگی۔ سیلاب کے آثار کو دیکھ کر جو شخص ہوش میں نہ آئے اور اپنے گھر کی حفاظت نہ کرے اس کا گھر سیلاب کی نذر ہو کر رہے گا کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔

اب ہم ان موٹے موٹے اعتراضات کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیں گے جو عورت کے حقوق پر کیے جاتے ہیں۔

مرد کی حکومت

اسلام نے ازدواجی زندگی کے ہر پہلو پر تفصیل سے بحث کی ہے اور خاندان کا ایک وسیع اور جامع نقشہ پیش کیا ہے۔ اس پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں مرد کو غیر معمولی حقوق اور اختیارات دیے گئے ہیں اور عورت کی آزادی سلب کرلی گئی ہے۔ مرد صاحب اقتدار اور حاکم ہے اور عورت زیر دست اور محکوم، مرد جس طرح چاہے اس پر حکومت کرسکتا ہے۔ جب تک وہ رشتۂ ازدواج میں بندھی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرسکتی۔

یہ تصویر جتنی بھیانک ہے اتنی ہی حقیقت سے دور بھی ہے۔ اس میں اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے کی شاید اتنی کوشش نہیں کی گئی ہے جتنی کہ انھیں مسخ کرنے اور بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میاں بیوی کا تعلق الفت و محبت کا تعلق ہے

سب سے پہلے اس مسئلہ کے دینی اور اخلاقی پہلو کو لیجئے یہی اسلام کے خاندانی نظام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلام کے نزدیک میاں بیوی کا تعلق اصلاً الفت و محبت کا تعلق ہے، جس میں دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھنے، اس کی ضروریات پوری کرنے اور اسے سکون اور راحت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس محبت کو قدرت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ	اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے
مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا	تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے
اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً	بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل
وَّرَحْمَۃً ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ	کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت
لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝	پیدا کردی۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان

لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ (الروم : ۲۱)

احادیث میں اس کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک اور صالح بیوی کی تعریف اس طرح کی ہے:

التی تسرہٗ اذا نظر وتطیعہٗ اذا امر ولا تخالفہٗ فی ما یکرہ فی نفسھا ومالہ [۱]	جب شوہر اسے دیکھے تو خوش کر دے، کوئی بات کہے تو مان لے اور اپنے نفس اور شوہر کے مال میں جس تصرف کا وہ ناپسند کرے اس کا ارتکاب کر کے اس کی مخالفت نہ کرے۔

اسی طرح حدیث میں با اخلاق شوہر کو بہترین انسان کہا گیا ہے حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی [۲]	تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو اور میں بھی اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہوں۔

اس مضمون کی بہت سی حدیثیں آئی ہیں[۳]۔ ان حدیثوں میں جو معیار بیان کیا گیا ہے اس پر اگر میاں بیوی اترنے کی کوشش کریں تو خاندان سکون کا مرکز ہوگا اور ایک مثالی معاشرہ کی بآسانی تعمیر ہو سکے گی۔

مرد خاندان کا سربراہ کیوں ہے؟

اب براہِ راست مرد کی سربراہی کے مسئلہ کو لیجئے۔ دنیا کے ہر چھوٹے بڑے ادارے کو ایک سربراہ اور نگراں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے نظم و ضبط کو درست رکھے اور اسے ٹھیک ٹھیک چلائے۔ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ادارے کے مفاد کو مقدم رکھے، اس کے افراد کے حقوق

---

[۱] مسند احمد ۲/۲۵۱۔ نسائی، کتاب النکاح، ای النساء خیر۔

[۲] ترمذی، ابواب المناقب باب فضل ازواج النبیؐ۔ ابن ماجہ کتاب النکاح باب حسن معاشرۃ النساء۔

[۳] ملاحظہ ہو راقم کی کتاب، عورت اور اسلام، ص ۲۲-۲۴

پہچانے اور ان کے ساتھ محبت وہمدردی کا سلوک کرے۔ ادارہ کے افراد کے لیے بھی ضروری ہے کہ خوش دلی سے اس کی اطاعت کریں، جب تک ادارے کا مفاد اس کے پیش نظر ہے، اس کے احکام سے سرکشی اور بغاوت نہ کریں اور آپس کے اختلافات میں اس کے حکم اور فیصلے کو آخری اور قطعی حیثیت دیں۔ سربراہی کا یہ مقام کسی ایک ہی فرد کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ افراد اس کے حامل ہوں اور سب اپنی آزاد مرضی چلانا چاہیں تو ادارہ کا نظم لازماً درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ خاندان بھی ایک ادارہ ہے اور بڑا پیچیدہ ادارہ ہے۔ اس کا نظم ونسق اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جبکہ اس کی سربراہی کسی ایک فرد کے ہاتھ میں ہو۔ اگر اس کے ساتھ دوسرے فرد کو بھی یہی حیثیت دے دی جائے تو اس کا نظم چل نہیں سکتا، بلکہ اس کے وجود کا باقی رہنا بھی دشوار ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ خاندان کا سربراہ مرد ہو یا عورت؟ اس کا جواب قرآن نے اس آیت میں دیا ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (النساء: ۳۴)	مرد قوام ہیں عورتوں پر اس وجہ سے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

اس میں مرد کو خاندان کا سربراہ مقرر کرنے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے عورت کے مقابلے میں فضیلت اور برتری حاصل ہے، دوسرے یہ کہ وہ اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خاندان کی سربراہی کے لیے مرد کا انتخاب قرآن نے کسی تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی صلاحیت اور مالی ذمہ داریوں کی وجہ سے کیا ہے۔ اب آئیے ان دونوں باتوں پر ذرا سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

مرد زیادہ قوت وطاقت رکھتا ہے

عورت اور مرد کی جسمانی اور ذہنی ساخت بتاتی ہے کہ خاندان کا بوجھ اٹھانے کے لیے جن قوتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ عورت کی بہ نسبت مرد میں زیادہ ہیں۔ وہ معاش کے لیے زیادہ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے، کھیتی باڑی، صنعت وحرفت اور دوسرے میدانوں میں مشکل اور

محنت طلب کام کر سکتا ہے، زندگی کے شدائد کا مقابلہ کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی اس کی بڑھی ہوئی ہے، بلکہ یہ حیرت انگیز حقیقت بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ جو کام خاص عورت کے سمجھے جاتے ہیں اور جن میں وہ شاید مدت حیات سے لگی ہوئی ہے ان میں بھی مرد زیادہ قوت و صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے، جیسے طباخی (کھانا پکانا) خیاطی (سینا پرونا) وغیرہ۔ عورت کا سینہ لطیف جذبات اور نازک احساسات کا مرکز ہے۔ وہ واقعاتِ مسرت اور حادثاتِ غم دونوں سے مرد سے کہیں زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اسے ان کے اظہار میں مرد کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہونا چاہیے لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ادب، شاعری، آرٹ اور فنون لطیفہ کے ذریعہ ان کیفیات کے بیان کرنے میں مرد جتنا کامیاب رہا، عورت اتنی کامیابی نہیں حاصل کر سکی۔ فنون لطیفہ کے سبھی شعبوں پر مرد کی حکمرانی رہی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام شعبوں پر بھی مرد کا قبضہ رہا اور عورت کو ان میں آگے بڑھنے اور اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ آخر ان تمام شعبوں پر مرد کا قبضہ کیسے ہو گیا اور عورت اس کشمکش میں کیسے پیچھے رہ گئی؟ اس لیے یہ بہرحال ماننا پڑے گا کہ مرد ہر میدان میں اپنی صلاحیت اور توانائی کا زیادہ ثبوت دے سکتا ہے اور دیا ہے۔

جب تجربہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ مرد کے اندر زیادہ قوت اور صلاحیت ہے تو فطری طور پر اسی کو خاندان کا سربراہ بھی ہونا چاہیے۔ مرد کی برتری کا اعتراف نہ کرنا اور عورت اور مرد کو ہر پہلو سے مساوی ثابت کرنا ایک طرح کا ردِ عمل یا تعصب ہے جو بحث و مباحثہ میں تو شاید کچھ چل جائے لیکن کارزارِ حیات میں زیادہ دور تک انسان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہاں بہت جلد حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

مالی بوجھ برداشت کرتا ہے

اب مرد کی مالی ذمہ داریوں کو لیجیے۔ اسلامی قانون کے تحت مرد پر عورت کا مہر، اس کا نان و نفقہ اور اس کے لیے رہائش اور سکونت کا نظم کرنا واجب ہے۔ اس کے ساتھ اس پر عورت کی تعلیم و تربیت، دینی و اخلاقی نگرانی اور اس کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔

مرد یہ ساری ذمہ داریاں اس لیے قبول کرتا ہے کہ عورت اس کی نگرانی میں اس کے گھر کا نظم چلائے گی، اسے سکون فراہم کرے گی، اس کے بچوں کی نگہداشت اور تربیت کرے گی اور ایک بہتر خاندان کی تعمیر میں مدد دے گی۔

ان نوع بہ نوع مالی اور انتظامی ذمہ داریوں کو ٹھیک ادا کرنے کے لیے مرد کو بعض حقوق واختیارات بھی دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہ حقوق اور اختیارات مطلق اور غیر محدود نہیں ہیں بلکہ ان کے کچھ حدود متعین ہیں۔ آدمی ان حدود ہی کے اندر اپنے اختیارات کو استعمال کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عملی زندگی میں اس بات کا امکان بہرحال ہے کہ مرد ان حدود سے تجاوز کر کے، جن کا اسلام نے اسے پابند بنایا ہے، اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرے اور عورت کے ساتھ زیادتی ہونے لگے۔ اسلام اس امکان کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس صورت میں عورت قانونی چارہ جوئی کر کے مرد کو ان حدود کی پابندی پر مجبور کر سکتی ہے۔ ناگزیر حالات میں وہ شوہر سے خلع یا علٰحدگی بھی حاصل کر سکتی ہے۔

کیا عورت خاندان کی سربراہ ہو سکتی ہے

بعض لوگ عورت کی حمایت میں چاہتے ہیں کہ مرد کو خانگی زندگی میں جو حقوق اور اختیارات حاصل ہیں وہ سب اس سے لے لیے جائیں۔ لیکن اگر یہ حقوق واختیارات اس سے لے لئے جائیں تو یہ توقع بھی اس سے نہیں کی جانی چاہیے کہ وہ ان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے گا جو سربراہ خاندان کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اس لیے جو صورت ممکن ہے وہ یہ کہ مرد کی جگہ عورت کو خاندان کا سربراہ اور حاکم مان لیا جائے۔ اسے وہ تمام حقوق واختیارات بھی دے دیئے جائیں جو مرد کو حاصل ہیں اور مرد کی ساری ذمہ داریاں بھی اس پر ڈال دی جائیں۔ جب تک عورت ان ذمہ داریوں کو نہ اٹھائے ظاہر ہے اس کی سربراہی کا کوئی جواز نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کے نان ونفقہ اور اخراجات کا اب کوئی مسئلہ نہیں رہا اس لیے کہ عورت کمانے لگی ہے اور معاشی طور پر آزاد ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کہ ایسی عورتوں کا تناسب آج بھی بہت کم ہے جو معاشی طور پر خود کفیل ہوں، مسئلہ صرف عورت کی روزی روٹی ہی کا نہیں بچوں کی معاش، ان کی نگہداشت، تعلیم وتربیت، شادی بیاہ اور خاندان کے دوسرے افراد کے مختلف مسائل کا بھی

ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت اپنا معاشی بوجھ برداشت کرنے کے ساتھ سربراہِ خاندان کی حیثیت سے ان سب ذمہ داریوں کو بھی اٹھانے کے لیے تیار ہے؟

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ ایسی عورتیں رہی ہیں جن کی معاشی حیثیت بھی مضبوط تھی اور جو خاندان کا نظم بھی بہتر طریقہ سے چلا سکتی تھیں، ایسی عورتیں آج بھی ہیں، اور آئندہ بھی ہوں گی۔ بحث ان معدودے چند عورتوں کی نہیں پوری صنفِ نازک کی ہے۔ بظاہر وہ اپنے خیرخواہوں کے مشورہ اور تائید کے باوجود نہ تو اپنے نان و نفقہ کے حق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہے اور نہ اس کے لیے آمادہ ہے کہ خاندان کا بوجھ شوہر کے سر سے اتار کر اپنے سر پر رکھ لے۔

حجاب کی بندشیں

عورت کے اندر بے حجابی کا رجحان پیدا کیا گیا

دورِ جدید کی تہذیبی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عورت کے اندر بے حیائی اور عریانی کا رجحان پیدا کر دیا۔ یہ رجحان جس زور اور قوت سے بڑھتا گیا اس کی عریانی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عورت کی عریانی سے مرد کو جنسی لذت حاصل ہوتی ہے، اس لئے اس نے اس پر نہ تو کوئی اعتراض کیا اور نہ کوئی پابندی ہی لگائی بلکہ اسے اور بڑھانے کی کوشش کی۔ اس نے عورت کے ذہن میں یہ تصور بٹھا دیا کہ اس کے حسن و جمال کو عریاں اور بے حجاب ہونا چاہئے۔ یہ اس کی شخصیت کی توہین ہے کہ اسے سات پردوں میں چھپایا جائے۔ صنفِ مقابل سے اس کا حجاب غیر فطری ہے۔ اس کا لباس اس کے جسم کی خوبیوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے نہیں، انھیں بے نقاب کرنے کے لیے ہے تاکہ صنفِ مقابل کی کشش اس کی طرف بڑھے، اس کے خوابیدہ جذبات تک جاگ اٹھیں اور وہ اس کی طرف بے تابہ کھنچ پڑے۔ جس لباس میں دل ربائی کی یہ شان نہ ہو وہ عورت کے تنِ نازک پر زیب نہیں دیتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورت کے لباس میں ایسی قطع و برید شروع ہوئی کہ اس کے جسم کے سارے پیچ و خم نمایاں ہونے لگے اور ان حصوں کی بھی نمائش ہونے لگی جن کا کبھی کسی کے سامنے کھلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب جسم پر چند دھجیاں بڑی ناگواری کے ساتھ رہ گئی ہیں۔ معلوم نہیں وہ بھی کب اتر جائیں گی۔ خیال ہوتا ہے کہ شائد یہ بوجھ اسے زیادہ دنوں اٹھانا نہیں پڑے گا اس لیے کہ مکمل عریانی کی تبلیغ شروع ہو چکی ہے اس کے حق میں دلائل فراہم کیے جا رہے ہیں، اسے عین انسانی فطرت کہا جا رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس طرف قدم بڑھا چکی ہے۔ انسانی فطرت کی اس طرح توہین اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔

مرد کا لباس زیادہ ساتر ہے

موجودہ دور نے عریانی کو ایک فن اور آرٹ بنا دیا اور اس کے حق میں ایسی فضا پیدا کردی کہ عورت نے خوشی خوشی شرم وحیا کا زیور اتار پھینکا اور بغیر کسی جھجک کے نیم عریاں گھومنے لگی۔ لیکن طرفہ تماشہ یہ ہے کہ مرد نے اس آرٹ کو نہیں اپنایا۔ چنانچہ اس کے لباس میں اتنی عریانی نہیں آئی جتنی عورت کے لباس میں ہے۔ بلکہ اس کا لباس تہذیب کی ترقی کے ساتھ شاید کچھ زیادہ ہی ساتر ہوتا جارہا ہے۔ وہ خود تو موسم کے لحاظ سے کپڑے زیب تن کرتا ہے اور بے چاری عورت کو سخت سردی میں بھی پورا تن ڈھکنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا لباس تو ڈھیلا ڈھالا اور آرام دہ ہوتا ہے لیکن عورت کے لیے وہ اس قدر چست اور تکلیف دہ لباس تجویز کرتا ہے کہ اس کے ایک ایک عضو جسم کی پیمائش ہوجائے اور اسے آرام بھی نہ ملے، موٹے سے موٹا کپڑا استعمال کرنا اس کے لیے معیوب نہیں ہے لیکن عورت کے لیے اس قدر مہین اور باریک کپڑے پہنتا ہے کہ پورا جسم اندر سے چھن چھن کر نظر آنے لگتا ہے۔ یہ عجیب وغریب تضاد ہے مرد کے رویہ میں۔ لیکن عورت ابھی اس تضاد کو محسوس نہیں کر رہی ہے۔ حالانکہ مرد جب سر سے پیر تک کئی کئی کپڑوں میں ملبوس، عورت کو کھلے بازار میں نیم عریاں لے کر چلتا ہے تو اس کے اس رویہ کے خلاف عورت کو بغاوت کر دینی چاہیے۔ لیکن عورت اپنی نادانی سے اسے تہذیب کا تقاضا سمجھ بیٹھی ہے۔ اپنے جسم کی نمائش پر ندامت سے اس کا سر جھکنا تو درکنار فخر وغرور سے اونچا ہوجاتا ہے اور وہ پورے ناز وادا کے ساتھ مرد کی ہم نوا بن جاتی ہے۔

عریانی کے اس ماحول میں اگر کوئی عورت اسلامی حدود کی پابند ہو اور اپنے جسم کو اغیار کی نظروں سے چھپائے رکھے تو ہوس پرست مرد کا خون کھولنے لگتا ہے۔ وہ اسے ایک ایسی چلتی پھرتی لاش معلوم ہوتی ہے جس سے جذبات کو وہ آسودگی نہیں ملتی جس کی تلاش میں اس کی نگاہیں ہر طرف بھٹکتی پھرتی ہیں۔

آئیے اب ذرا ان دلائل کا جائزہ لیا جائے جن کی بنیاد پر، پردہ کی مخالفت کی جاتی ہے۔

حجاب فطری جذبات پر قدغن نہیں ہے

ایک دلیل یہ دی جاتی ہے، ویسے اب اس میں کوئی جان نہیں رہی کہ عورت اور مرد کے

درمیان حجاب سے ان کے جنسی جذبات اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں اور وہ سخت نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں حجاب انسان کے ایک فطری جذبہ پر غیر ضروری قدغن ہے۔ جب فطری جذبات پر قدغن لگائی جاتی ہے تو موقع ملنے پر وہ زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور ان کے بڑے بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہ لغو اور مہمل فلسفہ انسان کی نفسیات کے بالکل خلاف ہے۔ تجربات ہمیشہ اس کی تردید کرتے رہے ہیں۔ خود مغرب کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ بے حجابی اور مرد و زن کے اختلاط سے جنسی جذبات زیادہ بھڑکتے ہیں اور زنا اور بدکاری عام ہوتی ہے۔ چنانچہ آزادانہ جنسی تعلقات مغربی معاشرے کا ناسور بن چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے جس طرح خاندان کے خاندان تباہ ہو رہے ہیں، اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور جسمانی، دماغی اور اعصابی امراض پھیل رہے ہیں، اس سے مغربی تہذیب کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ ان بھیانک نتائج کو دیکھنے کے بعد کوئی سلیم الفطرت انسان بے پردگی کی حمایت اور تبلیغ کیا کرے گا وہ تو قانونِ حجاب کو زیادہ ضروری قرار دے گا۔ اگر یہ قانون موجود نہ ہوتا تو اس کی فطرت اسے مجبور کرتی کہ وہ اس کے لیے قانون وضع کرے اور عورت اور مرد دونوں کو اس کا پابند بنانے کی کوشش کرے۔

کیا حجاب ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟

کہا جاتا ہے کہ پردہ مسلمان عورت کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ادبار اور تنزل کا شکار ہے اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی سے عملاً کٹ کر رہ گئی ہے۔ اس بندش سے آج جو عورتیں آزاد ہیں انھوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور کر رہی ہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی پردہ کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ کسی کے نزدیک اسلام کا پورا خاندانی نظام ہی رکاوٹ ہے جو عورت کو گھر کی چہار دیواری میں بند کر دیتا ہے۔ کسی کے خیال میں اسلامی عبادات مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ نماز کی وجہ سے کام کے بہترین اوقات میں خلل واقع ہوتا ہے۔ روزہ جیسی سخت عبادت سے صحت برباد ہوتی ہے اور حج میں وقت اور مال دونوں کا ضیاع ہے۔ کسی کی فہم و دانش میں اسلام کے مابعد الطبیعی نظریات رکاوٹ ہیں۔ بے چارہ مسلمان حیران ہے کہ ان میں سے کس کے

مشورہ پر عمل کیا جائے اور کس کے حکم کو نظر انداز کیا جائے۔ کس کو خوش کیا جائے اور کس کی ناراضی مول لی جائے؟ تکلف برطرف بہت سے زیرک و دانا حضرات اسلام ہی کو مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور فرماتے ہیں لیکن ایک عام مسلمان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اپنی ہزار کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود اسلام سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے۔

پھر یہ کہ عورت کی جس ترقی کا ذکر کیا جاتا ہے اس سے اگر وہ ترقی مراد ہے جو اُس نے 'فنونِ لطیفہ' کے نام پر عریانی، بے حیائی اور رقص و موسیقی وغیرہ میں کی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس نے اس میدان میں بڑی منزلیں طے کی ہیں اور ترقی کے بام عروج پر پہنچ چکی ہے، لیکن اس کے لیے اسے شرم و حیا، عفت و عصمت، لطف و محبت اور اطاعت و وفا شعاری جیسی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو قربان کرنا پڑا ہے۔ ان قدروں کی پامالی کے بغیر یہ 'ترقی' ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلام کا اس معاملہ میں ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ اس کے نزدیک ترقی وہ ہے جو انسان میں اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا کرے۔ جس ترقی سے یہ اوصاف پامال ہوں اسے وہ ترقی ہی نہیں تسلیم کرتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں عورت نے اس سے ہٹ کر بھی مختلف علوم و فنون میں ترقی کی ہے اور علمی اور تحقیقی خدمات انجام دی ہیں۔ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ پردہ کے حدود میں رہتے ہوئے یہ ترقی ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی بے پردگی اور بے حیائی کے اس ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہر طرف چھایا ہوا ہے، اس ماحول سے ذہن خواہ مخواہ مرعوب ہے اور آدمی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ عورت کسی پاکیزہ ماحول میں ترقی کیسے کر سکتی ہے؟ حالانکہ یہ ترقی بے پردگی کی رہینِ منت ہرگز نہیں ہے۔ اس کے اسباب دوسرے ہیں۔

ایک تو جن خواتین نے کوئی بڑا کام انجام دیا وہ ان کی محنت، جدوجہد اور اپنے کام سے ان کے خلوص اور تعلق کا نتیجہ ہے۔ ان کی اس خوبی کا اعتراف ضرور کرنا چاہئے۔ یہ خدا کا قانون ہے کہ جو خلوص اور لگن کے ساتھ محنت کرتا ہے اس کا صلہ اسے ملتا ہے۔

دوسرے یہ کہ موجودہ تہذیب ایک ننگی تہذیب ہے۔ اس میں علم و فن کی سہولتیں بھی اسی وقت عورت کو مل سکتی ہیں جب کہ وہ اپنا حجاب ختم کر کے بے حیاؤں کی صف میں کھڑی ہو جائے۔ اس طرح عملاً ان خواتین کے لیے ترقی کی راہیں بند کر دی گئی ہیں جو اپنا حجاب باقی رکھنا چاہتی ہیں۔ ترقی کا تعلق حجاب

یا بے حجابی سے نہیں بلکہ ان سہولتوں سے ہے جو عورت کو ملتی ہیں۔ اس دور کا تجربہ خود بھی بتاتا ہے کہ جن باپردہ خواتین کو جتنے مواقع ملے انھوں نے اتنی ترقی کی اور بے پردہ خواتین سے پیچھے نہیں رہیں۔

پھر یہ کہ یہ کلیہ اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جب کہ عورت نے حدودِ حجاب میں رہ کر ترقی نہ کی ہو یہ ایک واقعہ ہے کہ مسلمان عورت نے ان حدود کو توڑ کر کوئی قابلِ فخر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اور کوئی عائشہ صدیقہؓ، کوئی ام سلمہؓ، کوئی اسماء بنت ابوبکرؓ، کوئی فاطمہ بنتِ خطابؓ اور کوئی خنساءؓ ان میں نہیں پیدا ہوئیں۔

ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک طرف انھوں نے علم کی اونچی سے اونچی چوٹی سر کی، دوسری طرف وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی رجحانات سے بھی غیر متعلق نہیں رہیں بلکہ ان پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

اسی ساری تگ و دو کے ساتھ ان کی گودوں سے ایسے لعل و جواہر ابھرے جنھوں نے تاریخ کو زینت بخشی اور ایسے اساطینِ علم اور ائمہ فن نے تربیت اور نشو و نما پائی جن کے علمی اور تہذیبی احسانات سے نوعِ انسانی سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ کیا یہ سب کچھ جاہل اور ان پڑھ خواتین کے ہاتھوں انجام پایا؟

حدودِ حجاب کی بحث اور اس سے غلط استدلال

پردہ پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان سے گھبرا کر بعض لوگ فوراً معذرت کرنے لگتے ہیں کہ مولویوں نے پردہ کے نام پر طرح طرح کی بندشیں عائد کر دی ہیں۔ اسلام ان بندشوں کے خلاف ہے۔ اسلامی شریعت میں عورت کے ہاتھ اور چہرہ کا پردہ نہیں ہے۔ وہ انھیں اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہے۔ پھر اس اجازت کا دائرہ وہ اس آزادی تک وسیع کرنا چاہتے ہیں جو موجودہ دور میں عورت کو حاصل ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ عورت کے حدودِ حجاب میں ہاتھ اور چہرہ داخل ہے یا نہیں؟ اسے اگر ہم مان بھی لیں کہ عورت ہاتھ اور چہرہ کھول سکتی ہے تو بھی جس آزاد فضا میں عورت اس وقت زندگی گزار رہی ہے اس کے لیے کوئی وجہ جواز اسلام سے فراہم نہیں کی جاسکتی۔[1]

---

[1] راقم نے اپنے ایک مقالہ میں احکام حجاب سے بحث کی ہے اس میں ان حضرات کے دلائل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام عورت اور مرد کے تعلقات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ حجاب اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہ نقطۂ نظر موجودہ دور کے نقطۂ نظر سے قطعاً مختلف ہے اور قدم قدم پر اس سے ٹکراتا ہے۔ اسلام نے عورت کی توجہ کا اصل مرکز اس کا گھر بتایا ہے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ عورت بغیر کسی ضرورت اور مجبوری کے گھر سے نکلے۔ موجودہ دور اس بات کو ماننے ہی کے لیے تیار نہیں ہے کہ عورت کا مرکزِ عمل اس کا گھر ہونا چاہیے۔ اسلام اختلاط مرد وزن کا سخت مخالف ہے، جب کہ یہ اختلاط موجودہ معاشرت کا لازمی عنصر ہے۔ اسلام نے غضِ بصر کا حکم دیا ہے، جب کہ موجودہ دور کے افکار کا سارا دفتر اس تصور ہی سے خالی ہے کہ کسی اجنبی عورت پر کبھی نظر پڑ بھی جائے تو آدمی کو فوراً نگاہیں نیچی کرلینی چاہئیں۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ مفت کی ایک لذت سے محروم ہونے کو بدذوقی قرار دے۔ اسلام تعلیم و تربیت، کھیل کود اور تفریح کے میدان میں عورت اور مرد کے اختلاط کو ان کے اخلاق کے لیے تباہ کن سمجھتا ہے جب کہ موجودہ دور میں یہ سارا نظام دونوں کے اختلاط ہی پر مبنی ہے اور اسے اس کی خوبی سمجھا جاتا ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ عورت گھر سے نکلے تو راستہ میں کنارے کنارے اور مردوں سے بچ کر چلے، عبادات تک میں اس نے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ رہنے کی تعلیم دی ہے، جب کہ موجودہ دور عورت کے ساتھ اس 'امتیازی سلوک' کا روادار نہیں ہے۔ وہ سڑکوں پر، بازاروں میں، آفسوں میں، سماجی اور معاشرتی پروگراموں میں عورت کو مرد کے شانہ بشانہ اور دوش بدوش دیکھنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک حجاب ہی نہیں اسلام کے بہت سے صریح احکام کو توڑے بغیر کوئی مسلمان عورت زندگی کی تگ ودو میں اس آزادی کے ساتھ حصہ نہیں لے سکتی جس آزادی کے ساتھ آج کی عورت لے رہی ہے۔

موجودہ دور عورت کو بے قید زندگی کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام اخلاقی حدود و قیود کو اس کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ دونوں کی منزل بالکل آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنی سمتِ سفر اور اپنی منزل کا فیصلہ کرسکتی ہے۔

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جو چہرہ اور ہاتھ کو علاوہ حجاب میں داخل نہیں سمجھتے اور ان فقہا کی رائے کو ترجیح دی ہے جن کے نزدیک عورت کا چہرہ بھی حجاب میں داخل ہے اور وہ کسی شدید ضرورت کے تحت ہی اسے اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ماہنامہ زندگی رامپور جلد ۲۰ شمارہ ۳،۴ مارچ اپریل ۱۹۵۸ء

عورت کا معاشی مسئلہ

عورت کی معاشی جدوجہد

(کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو معاشی دوڑ دھوپ کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ یہ اس کا ایک فطری اور بنیادی حق ہے کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ حصول معاش کی جدوجہد کرے اور صنعت و حرفت، تجارت و زراعت غرض جس اقتصادی شعبہ میں چاہے مرد کی طرح حصہ لے۔ اس کے بغیر اسے معاشی ترقی اور استحکام حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ مرد کی دست نگر رہے گی اور سماج میں فروتر سمجھی جائے گی۔ اس فلسفے کے تحت مغرب میں عورت اور مرد کے کام کے دائرے جو الگ الگ تھے ایک ہو گئے اور عورت معاش کے میدان میں مرد کے ساتھ تگ و دو میں مصروف ہو گئی۔ مشرق بھی اسی طرف تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ اس کے نتائج خاندان اور معاشرہ کے حق میں بڑے خراب نکلے۔ مغرب میں تو ان کی تلخی کسی قدر محسوس کی جا رہی ہے، لیکن مشرق کو تجربہ کے جوش میں ابھی شاید اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔

کمزور اور طاقتور کا مقابلہ

یہاں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ عورت ایک کمزور اور نازک صنف ہے۔ وہ سخت اور محنت طلب کام انجام نہیں دے سکتی۔ اس پر ان کاموں کا بوجھ ڈالنا بہت بڑی زیادتی ہوگی جن کے اٹھانے کے لیے وہ جسمانی اور دماغی لحاظ سے کسی طرح فٹ نہیں ہے۔ وہ جب تک جوان رہتی ہے۔ حمل، رضاعت، حیض اور نفاس کی تکلیفیں اسے برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس سے اس کی صحت غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے اور اس کی قوتِ کار گھٹ جاتی ہے۔ ان مراحل سے پوری جوانی میں اسے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مراحل جب طے ہوتے ہیں تو وہ جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کی قوتیں کمزور پڑنے لگتی ہیں۔ موجودہ دور اس معاملہ میں عجیب تضاد کا شکار ہے۔ وہ

زبان سے تو اسے ہر کام کا اہل قرار دیتا ہے لیکن عمل کی دنیا میں اسے صنف نازک مان کر معاملہ کرتا ہے۔ ہلکے پھلکے کام تو اس سے لیے جاتے ہیں اور پیچیدہ اور دقت طلب کاموں کے لیے اسے مناسب تصور نہیں کیا جاتا چنانچہ آج وہ زیادہ سے زیادہ دکانوں پر سودا فروش Sales Woman ہے، کہیں کلرک ہے، کسی کی سکریٹری ہے، کسی جگہ ٹائپسٹ ہے، بہت ترقی کی تو ٹیچر ہے، نرس ہے ڈاکٹر ہے۔ اس کے برخلاف فوج میں اس کا وجود نہیں ہے۔ بھاری مشینیں اس کے حوالہ نہیں کی جاتیں، پرخطر مہمات کے لیے اس کا انتخاب نہیں ہوتا۔ وہ پائلٹ اور کپتان نہیں ہے۔ بھاری گاڑیاں وہ نہیں چلاتی، حتیٰ کہ نازک آپریشن کے لیے بھی مرد کی تلاش ہوتی ہے۔ اس کی قوتِ کار مرد کے مقابلہ میں کم سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کم از کم پرائیوٹ اداروں میں اس کی تنخواہ مرد سے کم ہوتی ہے۔ یہ حال ان ممالک کا بھی ہے جہاں ایک ہی کام کے لیے عورت اور مرد کی تنخواہ میں فرق کرنا قانوناً جرم ہے۔

کشمکش کا نتیجہ

عورت کی معاشی جدوجہد نے مرد کے ساتھ اس کی ایک طرح سے کشمکش پیدا کر دی۔ ان کے درمیان محبت کی فضا باقی نہیں رہی اور حریفانہ جذبات نشو و نما پانے لگے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ملازمت میں دونوں کا مقابلہ ہونے لگا اور ہر ایک نے دوسرے کو پیچھے ہٹانے اور خود کو آگے بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن یہ ایک طاقتور صنف اور ایک کمزور صنف کا مقابلہ تھا۔ مرد اپنی قوت و صلاحیت کی وجہ سے آگے رہا اور عورت اس کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ زمانہ قدیم کی طرح آج بھی قوموں کی قیادت و سیادت مرد ہی کے ہاتھ میں ہے، اہم عہدوں اور مناصب پر اسی کا قبضہ ہے، زندگی کے سارے شعبوں پر وہی چھایا ہوا ہے۔ عورت اس سے آگے کیا نکلتی اس کی ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔ چند شاذ و نادر مثالوں سے اس کی تردید نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس طرح کی مثالیں ہر دور میں مل جاتی ہیں۔ دورِ حاضر ہی کے ساتھ یہ مخصوص نہیں ہیں۔

عورت نے کیا کھویا کیا پایا؟

کہا جا سکتا ہے کہ اس سب کے باوجود عورت کی معاشی حالت پہلے سے بہتر ہے اور

وہ خود کفالت اور معاشی استحکام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اس حقیقت کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے کہ معاش کی خاطر وہ اپنے دین و اخلاق کی بڑی قربانی دے رہی ہے اور اپنے آپ کو ہر خریدار کے سامنے ایک متاعِ کاسد کی حیثیت سے پیش کرنے پر مجبور ہو گئی ہے چند ٹکوں کے لیے اسے اپنی قدر و قیمت گھٹانی پڑی ہے اور اپنا احترام اور وقار کھو کر مرد کے لیے حصولِ دولت کا ایک سستا ذریعہ بننا پڑا ہے۔ آج تجارت اور صنعت و حرفت پر مرد کا قبضہ ہے، بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، بازار اور منڈی اسی کی ہے، حتیٰ کہ بڑے بڑے ہوٹل، کلب گھر اور سنیما کا مالک وہی ہے۔ اس طرح سارے وسائلِ دولت اس کے پاس ہیں اور عورت اس کے پھیلے ہوئے کاروبار کو فروغ دینے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ مرد اپنی تجارت کو بڑھانے اور اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کے لیے اسے استعمال کر رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ ہزار روپیہ کی کوئی چیز ہو یا دو پیسے کی، عورت کی پرکشش اور دل لبھانے والی تصویر اس پر ضرور موجود ہوگی۔ بات صرف اشتہار کی حد تک نہیں رکی بلکہ عورت کو کھلے بازار میں اس لیے بٹھایا گیا کہ وہ اپنی ناز و ادا سے مرد کی تیار کردہ مصنوعات کو فروخت کرے، اس کے قائم کردہ ہوٹلوں اور کلبوں میں مہمانوں کا استقبال، خاطر تواضع اور خدمت کرے، اس کے سینما ہالوں میں تھرک تھرک کر اپنے جسم کے پیچ و خم کی نمائش کرے اور اس کے لیے وقت ضرورت نیم عریاں ہی نہیں پوری طرح برہنہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اپنی معاش کی خاطر شاید اس طرح کبھی ذلیل اور رسوا نہ ہوئی ہوگی۔

کیا دورِ جدید میں عورت کے لیے معاشی جد و جہد ضروری ہے؟

عورت کی ان معاشی سرگرمیوں کے جواز میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ موجودہ دور میں معاشی ضروریات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ تنہا مرد انھیں پورا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے عورت کا معاشی جد و جہد میں شریک ہونا ضروری ہے۔ عورت اور مرد کی مشترکہ جد و جہد ہی سے آج کسی خاندان کے معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں چند باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔

۱۔ اس وقت ہر شخص کے سامنے مغرب کا معیارِ زندگی ہے۔ اسی منزل تک پہونچنے کے لیے

وہ مضطرب اور بے چین ہے اسی کے لیے وہ سمجھتا ہے کہ عورت کے پاس لازماً کوئی ذریعہ معاش ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ مغرب میں کام کے قابل ساری عورتیں برسرِ روزگار نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس فی فیصد عورتوں کے پاس کوئی ذریعہ معاش ہے۔ ان برسرِ روزگار عورتوں کی بھی اکثریت مردوں کے مقابلہ میں چھوٹے چھوٹے اور معمولی نوعیت کے کام کرنے پر مجبور ہے۔ جس کی وجہ سے وہ خاندان کی آمدنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر پاتیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا مغرب میں صرف ان ہی خاندانوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں جن کی عورتیں خوب کما رہی ہیں اور وہ سارے خاندان معاشی پریشانیوں میں گرفتار ہیں جن کی عورتوں کے پاس آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہیں ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ عورت کی معاشی جدوجہد ہی سے خاندان کے مصارف پورے ہو سکتے ہیں، اس کے بغیر اس کی ضروریات کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

۲۔ موجودہ دور میں 'ضروریات' کی کوئی مختصر فہرست نہیں ہے بلکہ یہ اتنی لمبی چوڑی فہرست ہے کہ اس میں ناگزیر اور ضروری چیزیں اور بہت سارے اسباب تعیش بھی داخل ہیں، یہ فہرست ابھی مکمل نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آدمی اس بڑھتی ہوئی فہرست کے مطابق ساز و سامان فراہم کرنے میں شب و روز دیوانوں کی طرح دوڑتا پھر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود 'ضروریات' ہیں کہ پوری ہی نہیں ہوتیں۔ اگر یہ کسی طرح پوری ہو بھی جائیں تو روز بدلتا ہوا فیشن اور نت نئے نمونوں (Models) کی ایجاد اسے سکون اور چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔

۳۔ موجودہ دور نے معاشی مسابقت کا اتنا شدید رجحان پیدا کر دیا ہے کہ آدمی کے پاس لاکھوں، کروڑوں کا بینک بیلنس ہو یا قارون کا خزانہ ہی اس کے ہاتھ لگ جائے تب بھی اس کی معاشی بھوک نہیں مٹتی اور وہ 'ھل من مزید' کا نعرہ لگاتا رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ عورت بھی معاشی جدوجہد میں کود پڑے بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس دنیا اور اس کے اسباب و وسائل کے بارے میں انسان کا ذہن بدلے اور وہ حرص و ہوس کے جہنم سے نکلنے کی کوشش کرے۔ جب تک یہ ذہن نہ بدلے معاشی جدوجہد میں مرد کے ساتھ عورت ہی نہیں، گھر کا بچہ بچہ شریک ہو تو بھی آدمی کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

۴۔ عورت کی معاشی جدوجہد سے خاندان کی آمدنی میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن

فطری طور پر گھر کی طرف اس کی توجہ نہیں ہو پاتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی توجہ سے گھر کے مصارف کم ہوتے ہیں اور اس کی توجہ نہ ہو تو اخراجات قابو سے باہر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس کی آمدنی کا عملاً بہت کم فائدہ پہونچتا ہے۔

۵۔ عورت کی معاشی سرگرمی کی وجہ سے گھر کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگتے ہیں اور بچوں کی صحیح تربیت نہیں ہو پاتی۔ مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے پورے گھر کا نظام ہی درہم برہم ہو جاتا ہے اور گھر کی حیثیت محض ایک سرائے کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت کی آمدنی اتنی قیمتی ہے کہ اس کے لئے وہ اور پورا معاشرہ اتنا بڑا نقصان برداشت کرے؟

اسلام میں عورت کی خاندانی ذمہ داریاں مقدم ہیں

اسلام معاش کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ عورت یکسوئی کے ساتھ خاندانی فرائض انجام دیتی رہے اور معاشی مصروفیت کی وجہ سے وہ ان سے بے رخی یا غفلت برتنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے خاندان کی معاشی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے اور عورت کو اس سے سبک دوش کر دیا ہے۔ تاکہ دونوں صرف معاشی جدوجہد ہی میں نہ لگ جائیں بلکہ مرد معاش کے لئے تگ و دو کرے تو عورت گھر کا انتظام سنبھالے۔ اس طرح دونوں مل جل کر باہمی تعاون سے خاندان کا نظام چلائیں۔

عورت کی معاشی حیثیت مستحکم ہے

گھر کے اندر عورت کی مصروفیت کی وجہ سے اسلام نے اس کی معاشی حیثیت کو کمزور ہونے نہیں دیا بلکہ اسے مرد سے زیادہ مستحکم رکھا ہے۔ اس کے لئے اس نے دو قانونی اقدامات کئے ہیں۔

۱۔ عورت پر کوئی معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ صرف یہی نہیں کہ اس پر اپنی اولاد، ملں

باپ یا کسی قریب سے قریب تر رشتہ دار کی معاش کا بوجھ نہیں ہے بلکہ خود اس کی معاشی ذمہ داری بچپن میں اس کا باپ اٹھاتا ہے۔ شادی کے بعد یہ ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے اولاد اس قابل نہ ہو تو باپ یا قریبی محرم کو اس کی کفالت کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

۲۔ وراثت میں عورت کا حق رکھا۔ ماں باپ، شوہر اور اولاد کے مال اور جائداد میں اسے یہ حق لازماً ملتا ہے۔ بعض اوقات بھائی بہن کے مال میں بھی وہ وراثت کی حقدار ہوتی ہے۔ اسی طرح شوہر سے اسے مہر ملتا ہے۔ وہ ان زیورات اور تحفے تحائف کی بھی مالک ہوتی ہے جو شادی یا خوشی کے دیگر مواقع پر اسے دئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کا محفوظ سرمایہ ہے۔

عورت پر کوئی معاشی بوجھ نہ ہونے کی وجہ سے ان ذرائع سے جو آمدنی اسے ہوتی ہے وہ پوری کی پوری اس کے پاس محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب کہ مرد پر گوناگوں معاشی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ جو کچھ کماتا ہے اس کا بڑا حصہ ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر اسے خرچ کرنا پڑتا ہے۔

اس طرح اسلام کے خاندانی نظام میں عورت اپنی معاش کے لئے گھر چھوڑنے اور اس کی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور نہیں ہوتی اور اس سے وہ سماجی اور اخلاقی خرابیاں بھی نہیں پیدا ہوتیں جو عورت اور مرد کے ایک ساتھ مل کر معاشی دوڑ دھوپ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

عورت کی معاشی جد وجہد کے لیے بعض حدود

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام عورت کے لئے معاشی جد وجہد کو بالکل ممنوع قرار دیتا ہے اور اسے ان معاشی حقوق پر قناعت کرنے کا حکم دیتا ہے جو اسے خاندانی زندگی میں حاصل ہیں۔ بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام نے عورت کو اپنی اور دوسروں کی معاشی فکر سے آزاد کر رکھا ہے اس کے باوجود اگر وہ معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہے تو ضرور حصہ لے سکتی ہے۔ البتہ اسلام نے اسے حسب ذیل ہدایات دی ہیں اور ان کی

پابندی کا حکم دیا ہے۔

۱۔ عورت اصلاً گھر کی منتظم ہے۔ اس لئے اس کی اولین اور اصل توجہ کا مستحق اس کا گھر ہے۔ وہ شوہر کے مال کی محافظ اور اولاد کی نگراں ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کسی ایسی مصروفیت کا اختیار کرنا صحیح نہیں ہے جس سے وہ اپنی بنیادی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے قابل ہی نہ رہ جائے۔

۲۔ وہ خاندانی نظام میں مرد کے تابع ہے۔ اس کی اجازت ہی سے وہ کوئی بھی کام کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ اپنی آزاد مرضی سے کام کرنے لگے تو خاندان کا نظم باقی نہیں رہ سکتا۔

۳۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس میں کہ مردوں کے ساتھ اس کا اختلاط ہو۔ اس لئے کہ اس سے جو اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں اس کے مقابلہ میں ان فوائد کی کوئی اہمیت نہیں ہے جو عورت حاصل کر سکتی ہے۔

ان ہدایات کی پابندی کے ساتھ عورت اپنی قوت وصلاحیت، سن وسال، حالات، مواقع اور مزاج کے لحاظ سے کوئی بھی جائز ذریعہ معاش اختیار کر سکتی ہے۔ اسلام اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اسی طرح جو سرمایہ اس کے پاس ہو اسے اسلامی حدود کے اندر تمام نفع بخش کاموں میں لگا سکتی ہے۔ اس سے ہونے والی آمدنی پوری کی پوری اسی کی ہوگی۔ اس کا دعویٰ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

موجودہ دور میں ان حدود کی پابندی کے ساتھ عورت کے لئے معاشی جدوجہد بڑی دشوار محسوس ہوتی ہے، اس لئے کہ آج کا سارا معاشی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو اختلاط مرد و زن کو سماج کی ایک ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کی خوبی تصور کرتے ہیں اور جو خاندان کی شکست وریخت کو طوعاً وکرہاً برداشت کر رہے ہیں۔ مسلمان معاشرہ کی کمزوری یہ ہے کہ ابھی تک اس کے پاس کوئی ایسا معاشی نظام نہیں ہے جو عورت کے لیے معاشی جدوجہد کے مواقع بھی فراہم کرے اور موجودہ دور کی خرابیوں سے بھی پاک ہو۔ اس کمی کو جلد از جلد دور ہونا چاہیے۔

مہر کی نوعیت اور اس کے احکام

مہر کے ذریعہ عورت خریدی نہیں جاتی

بعض اوقات مہر کا اس طرح ذکر کیا جاتا ہے گویا مرد مال کے ذریعہ عورت کو خریدتا ہے۔ یہ مہر کی نوعیت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام کے نزدیک عورت خرید و فروخت کا سامان نہیں ہے بلکہ اس کی ایک الگ جداگانہ حیثیت ہے۔ وہ ماں باپ یا کسی اور کی ملکیت نہیں ہوتی کہ ان سے اسے خریدا جائے۔ اگر وہ ان کی ملکیت ہوتی اور مہر کے ذریعہ وہ اسے فروخت کرتے تو مہر کی رقم انھیں ملتی جب کہ ازروئے شریعت عورت خود مہر کی مالک ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ اگر شوہر مہر کی وجہ سے اسے خریدتا تو وہ شوہر کی ملکیت ہوتی حالانکہ نکاح کے ذریعہ شوہر کو عورت پر مالکانہ اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ شادی کے بعد بھی اس کی انفرادیت اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔

مہر کی نوعیت

اب آیئے ذرا تفصیل سے یہ دیکھیں کہ قرآن مجید نے مہر کو کس حیثیت سے پیش کیا ہے جن عورتوں سے نکاح حرام ہے سورہ نساء میں تفصیل سے ان کے ذکر کے بعد فرمایا۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً۔ (النساء: ۲۴)

ان کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں بشرطیکہ تم ان کو اپنے مال کے بدلے طلب کرو، قید نکاح میں لانے کے لیے نہ کہ بدکاری کے لیے۔ پھر ان میں سے جن عورتوں سے تم نے نکاح کے ذریعہ فائدہ اٹھایا ان کے مہر انہیں دو جو فرض ہے تم پر۔

اس سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) ایک یہ کہ محرمات کے علاوہ دوسری عورتیں حلال ہیں ان سے نکاح ہوسکتا ہے۔

(۲) اس کے لیے ضروری ہے آدمی مال کے ذریعہ انھیں طلب کرے۔

(۳) یہ طلب کرنا نکاح کے مقصد سے ہو، 'سفاح' یعنی زنا اور بدکاری کے لیے نہ ہو۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ زنا میں آدمی وقتی طور پر اپنی جنسی خواہش پوری کرکے عورت کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود اس کے نتائج بھگتتی رہے۔ اس کی کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف نکاح اس ارادے سے ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان مستقل تعلق ہوگا، دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے اور اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔

(۴) آیت کے سیاق سے یہ بات بھی واضح ہے کہ نکاح اور سفاح (بدکاری) کے درمیان مہر کی وجہ سے فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ مرد پر عورت کی جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں سے ایک مہر بھی ہے۔ مہر عورت کا قانونی حق ہے اور اس کا ادا کرنا مرد کے لیے ضروری ہے۔ زنا میں مرد اس طرح کی کوئی ذمہ داری نہیں قبول کرتا۔

(۵) مرد نکاح کے ذریعہ عورت سے جو فائدہ اٹھاتا ہے مہر اس کا صلہ یا بدل ہے۔ قرآن نے کہا:۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ	پھر ان میں سے جن عورتوں سے تم نے فائدہ اٹھایا انھیں ان کا اجر (یعنی مہر) دو۔

زمخشری کہتے ہیں کہ قرآن نے مہر کو 'اجر' سے تعبیر کیا ہے:

لان المهر ثواب على البضع[1]	اس لئے کہ مہر جنسی تعلق کا جزا یا صلہ ہے۔

فقہ حنفی میں مہر کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

إنه اسم للمال الذى يجب فى عقد النكاح على الزوج فى	مہر اس مال کو کہا جاتا ہے جو عقد نکاح میں شوہر پر جنسی استفادہ کے مقابلہ میں واجب

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۲۸۳ [2] العنایہ علی الہدایہ ۲/ ۳۳۴

مقابلة البضع اما بالتسمية او بالعقد[1] — ہو جاتا ہے۔ یہ مہر کے تعین سے بھی ہوسکتا ہے اور عقد کی وجہ سے بھی۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مہر کی وجہ سے مرد کو عورت سے جنسی استفادے کا تو حق ملتا ہے اس پر کسی قسم کا مالکانہ اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا۔ بلاشبہ عورت بھی مرد سے جنسی فائدہ اٹھاتی ہے لیکن اس پر مہر کی نوعیت کی کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عورت پر کوئی مالی بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس نے اسے ہر طرح کی مالی اور معاشی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر رکھا ہے۔

مہر خلوص کی دلیل ہے

مہر کو اجر اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ عورت کو نکاح کے مقابلے میں ملتا ہے جو اس کی قانونی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس کے لئے قرآن وحدیث میں 'صدقہ' اور 'صداق' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جو اس کی روح کی ترجمانی کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں ہے:

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً — عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو۔ (نساء: ۴)

'صدقہ' اور 'صداق' کے الفاظ 'صدق' سے نکلے ہیں۔ صدق کا لفظ عربی میں بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مفہوم میں اخلاص، محبت، دوستی، آدمی کا بات کا پکا ہونا، کسی سے جو حسن ظن ہو اس پر پورا اترنا، آزمائش کے وقت سچا ثابت ہونا وغیرہ اس میں شامل ہیں[2]۔

مہر کے لئے لفظ صدقہ کے استعمال میں بڑی معنویت ہے۔ علامہ صاوی کہتے ہیں: صدقہ کا لفظ صدق سے ماخوذ ہے جو کذب کی ضد ہے۔ مہر کے لیے صدقہ کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ اس کا میاں بیوی کے درمیان موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دل سے شریعت کی موافقت کرتے ہیں[3]۔

ملاجیون کہتے ہیں کہ یہ شوہر کے دعوائے محبت میں سچے ہونے کی دلیل ہے[4]۔

---

[1] العنایہ علی الہدایہ ۲/ ۴۴۴ [2] ابن منظور، لسان العرب، مادہ: ص۔ د۔ ق [3] حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر: ۲/ ۴۲۸ [4] التفسیرات الاحمدیہ ص ۱۲۹

حقیقت یہ ہے کہ مہر شوہر کے خلوص اور محبت کی علامت ہے، اسے بیوی کی قیمت قرار دینا اس کے خلوص کی توہین ہے۔ مہر کے ذریعہ شوہر یہ ثابت کرتا ہے کہ عورت نے اس کے ساتھ جو حسنِ ظن قائم کیا اس پر وہ پورا اترے گا اور اسے دھوکا اور فریب نہیں دے گا۔

مہر عطیہ ہے

اس کے ساتھ آیت میں 'نحلہ' کا لفظ بڑا معنیٰ خیز ہے جو اس جذبہ اور کیفیت کو زیادہ بہتر طریقے سے واضح کرتا ہے جو مہر کی ادائیگی کے سلسلے میں ہونا چاہیے یہاں 'نحلہ' کے تین مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ لغت کے لحاظ سے تینوں ہی مفہوموں کی گنجائش ہے:۔

(۱) دین و مذہب، یعنی عورتوں کو ان کے مہر ادا کرو۔ اس کا ادا کرنا شرعاً اور قانوناً تم پر فرض ہے۔

(۲) خوش دلی سے ادا کرنا، مطلب یہ کہ عورت کے مطالبے اور اصرار کے بغیر اس کا مہر بخوشی ادا کیا جائے۔ اس میں ٹال مٹول نہ کیا جائے اس لئے کہ جو چیز بحث و تکرار اور لڑائی جھگڑے کے بعد دی جائے اسے نحلہ نہیں کہا جاتا۔

(۳) عطیہ دینا، مہر عطیہ اس معنیٰ میں ہے کہ شوہر اس کے عوض عورت سے کچھ نہیں لیتا۔ باقی رہا ازدواجی زندگی کا فائدہ تو جس طرح مرد یہ فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح عورت بھی یہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔ اس مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

ان اللہ تعالیٰ جعل منافع النکاح من قضاء الشھوۃ والتوالد مشترکا بین الزوجین ثم امر الزوج بان یعطی الزوجۃ المھر فکان ذلک عطیۃ من اللہ ابتداء[1]	اللہ تعالیٰ نے منافعِ نکاح یعنی جنسی خواہش کی تکمیل اور اولاد کا پیدا کرنا، میاں بیوی کے درمیان مشترک رکھے ہیں (یہ کسی ایک ہی کو نہیں حاصل ہوتے) اس کے ساتھ اس نے شوہر کو حکم دیا کہ وہ بیوی کو مہر دے۔ یہ گویا اللہ کی طرف سے شروع ہی سے ایک عطا ہے۔

[1] تفسیر کبیر: ۱۲۵/۳۰

اوپر نحلہ کے جو مختلف معنی بیان ہوئے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ومضمون کلامھم ان الرجل یجب علیہ دفع الصداق الی المرأۃ حتما وان یکون طیب النفس لذالک کما یمنح المنیحۃ ویعطی النحلۃ طیبا بھا کذالک یجب ان یعطی المرأۃ صداقھا طیبا بذالک[1]

ان کی ان تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کے لیے قطعاً واجب ہے کہ وہ مہر بیوی کے حوالے کرے۔ یہ خوشی دلی سے ہونا چاہئے جس طرح آدمی خوشی کے ساتھ کسی کو کوئی عطیہ دیتا ہے اسی کیفیت کے ساتھ مہر بھی ادا کرے۔

عورت کا مہر واجب ہونے کے باوجود جس طرح اسے یہاں 'نحلہ' سے تعبیر کیا گیا ہے اسی طرح عورت کا نفقہ بھی واجب ہے۔ اسے حدیث میں 'صدقہ' کہا گیا ہے۔ ان الفاظ کی معنویت سے بحث کرتے ہوئے علامہ ابن المنیر کہتے ہیں:

تسمیۃ النفقۃ صدقۃ من جنس تسمیۃ الصداق نحلۃ فلما کان احتیاج المرأۃ إلی الرجل کاحتیاجہ الیھا فی اللذۃ والتأنیس والتحصین وطلب الولد کان الاصل الا یجب علیھا شیئ إلا ان اللہ خص الرجل بالفضل علی المرأۃ بالقیام علیھا ورفعہ بذلک درجۃ فمن ثم جاز اطلاق النحلۃ علی الصداق والصدقۃ علی النفقۃ[2]

نفقہ کو 'صدقہ' اسی معنی میں کہا گیا ہے جس معنی میں مہر کو 'نحلہ' کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ لذت نفس، انس ومحبت، عفت وعصمت اور اولاد کی طلب کے لیے جس طرح عورت کو مرد کی حاجت ہے، اسی طرح مرد کو بھی عورت کی حاجت ہے جب دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ مرد پر کوئی چیز واجب نہ ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مرد کو عورت پر یہ فضیلت دی ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ اسی لیے اس کا درجہ بلند کیا ہے۔ اس وجہ سے 'نحلہ' کا اطلاق مہر پر اور صدقہ کا اطلاق نفقہ پر جائز ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۵۱   [2] فتح الباری: ۹/ ۴۰۲-۴۰۱

مہر کا حکم قطعی اور ابدی ہے

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں مہر کو اظہار محبت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہو اور اس وقت اس کی اہمیت اور افادیت بھی رہی ہو لیکن ہر زمانے کے حالات اور سماجی رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ موجودہ دور کی سماجی قدریں اسے اس محبت کے منافی سمجھتی ہیں جو میاں بیوی کے درمیان ہونی چاہیے۔ اور آج عملاً مہر کی بہت زیادہ اہمیت بھی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لئے کہ عورت خود کمانے لگی ہے، کسی کی دست نگر نہیں ہے۔

اس پر دو پہلوؤں سے غور ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ شریعت نے مہر کو کیا حیثیت دی ہے؟ کیا یہ کوئی عارضی حکم تھا یا اس کی نوعیت ایک ابدی قانون کی ہے؟ دوسرے یہ کہ کیا مہر کی افادیت محض وقتی تھی جو وقت گذرنے کے ساتھ گذر گئی یا اس کی افادیت اب بھی باقی ہے؟

جہاں تک شریعت کا تعلق ہے اس نے اسے ایک ابدی حکم ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مہر سے متعلق بعض آیات اوپر گذر چکی ہیں۔ ان آیات میں مہر ادا کرنے کا مطلقاً حکم دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کے حالات کی کوئی شرط یا کسی زمانے کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید نے مہر کے احکام تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان کے ذیل میں بھی کہیں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا کہ یہ وقتی حکم ہے۔ اس طرح کے قطعی اور واضح احکام کے بارے میں بھی ان کے وقتی ہونے کا سوال کھڑا ہو جائے تو شاید قرآن شریف کا کوئی حکم ایسا نہیں ہوگا جسے ابدی کہا جا سکے۔

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مہر کے بغیر کسی عورت سے جنسی تعلق قائم کرنا حرام ہے چاہے عورت نے بخوشی اپنے آپ کو اس کے حوالے ہی کیوں نہ کر دیا ہو، الا یہ کہ وہ اس کی باندی ہو۔ ابن حجر فرماتے ہیں۔

وقد اجمعوا علی انه لا یجوز	کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ بغیر مہر کے
لاحد ان یطأ فرجا وهب له	وہ کسی عورت سے جنسی تعلق رکھے سوائے اس
دون الرقبة بغیر صداق[1]	کے کہ وہ اس کی لونڈی ہو۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔

[1] فتح الباری ۹/ ۱۶۷

ابنِ رشد کہتے ہیں۔

انهم اتفقوا على انه شرط من شروط الصحة وانه لا يجوز التواطؤ على تركه[1]	نکاح کے صحیح ہونے کے جو شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط مہر بھی ہے۔ اس کے ترک پر اتفاق کرلینا جائز نہیں ہے۔ اس مسئلے پر فقہاء کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے۔

مہر کی نوعیت ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص نکاح کے وقت یہ شرط لگا دے کہ وہ مہر ادا نہیں کرسکتا' یا یہ کہ وہ مہر کا ذکر ہی نہ کرے تو بھی حنفیہ کے نزدیک وہ خود بخود واجب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے کہ مہر دے یا نہ دے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کیا ہوا ایک فرض ہے جسے بہرحال پورا کرنا ہے۔ امام مالک تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ وہ نکاح ہی نہیں ہوگا جس میں آدمی نے مہر نہ دینے کی شرط لگا دی ہو[2]

مہر کی افادیت

اب اس کی افادیت پر غور کیجئے۔ نکاح سے جس جنسی تعلق کی اجازت ملتی ہے مہر سے اس کی قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے آدمی میں یہ احساس ابھرتا ہے کہ شریعت کی جس اجازت سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے اس کے لئے اس کو اپنا پیسہ صرف کرنا پڑا ہے۔ اور اس سے یہ جذبہ ختم ہوتا ہے کہ آدمی عورت کو حقیر اور بے قیمت سمجھے اور اس بات کو عورت پر بہت بڑا احسان سمجھے کہ اس نے اس کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا اور اس سے تعلق رکھا۔

مہر عقد زواج کو باقی رکھنے کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بات ہے کہ آدمی جس چیز کے حصول کے لیے اپنا پیسہ صرف کرے اس کو آسانی سے ضائع کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اس کو حتی الوسع باقی رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ طلاق کی راہ میں بھی یہ ایک رکاوٹ ہے۔ کیونکہ طلاق میں ایک تو موجودہ بیوی کا مہر جائے گا اور پھر دوسری شادی کے لیے اس کو دوبارہ مہر کی رقم خرچ

---

[1] بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ۲/۱۸ [2] العنایہ علی الہدایہ ۲/۳۳۲ - ۳۳۵

کرنی ہوگی۔

مہر میں ایک پہلو سے عورت کی دل جوئی بھی ہے اور مالی مدد بھی۔ اس سے وہ اپنی ضروریات میں فائدہ اٹھا سکتی ہے، کسی بہتر مصرف میں اس کو صرف کر سکتی ہے، یا نفع بخش کاموں میں لگا سکتی ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ آج عورت کے لئے معاش کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اس لئے مہر کی اہمیت نہیں ہے، اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کے لئے اتنی معاشی آسانیاں فراہم ہوگئی ہیں کہ وہ مرد سے بے نیاز ہوگئی ہے۔ ولو بالفرض اگر ایسا ہے بھی تو ان آسانیوں کی وجہ سے عورت کو مہر کے حق سے محروم کر دینا کیا اس کے حق میں مفید ہوگا؟ دوسرے یہ کہ مہر کی افادیت محض معاشی نہیں، اخلاقی اور نفسیاتی بھی ہے۔ کیا اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟[1]

مہر کی مقدار

مہر کی مقدار کا مسئلہ بھی بار بار ابھرتا رہتا ہے۔ یہاں اسکی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔ شریعت نے مہر کی مقدار متعین نہیں کی ہے، بلکہ اس کو زوجین کے معاشی و سماجی حالات، ان کی خاندانی روایات، باہمی تعلقات اور آپس کے اعتماد پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ چاہیں تو کم سے کم مہر بھی رکھ سکتے ہیں اور اس کی بھی انھیں اجازت ہے کہ وہ اپنے حالات کے تحت زیادہ سے زیادہ مہر مقرر کریں۔

وَاِنْ اَرَدْ تُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ	اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کو بدلنا
مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ	چاہتے ہو اور تم نے ان میں سے کسی کو بہت
قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا	مال دے دیا ہے تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ
اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا	لو۔ کیا تم اس کو لوگے جب کہ وہ تمہارے لیے
(النساء: ۲۰)	ناحق اور صریح گناہ ہوگا۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں مہر کی زیادتی سے منع فرمایا اور چار سو درہم اس کی آخری حد مقرر کرنا چاہی تو ایک عورت نے برسر منبر انھیں ٹوکا کہ آپ کو اس فیصلہ کا حق نہیں ہے اس لیے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ پھر اس نے اس آیت کا حوالہ دیا۔ یہ

---

[1] عورت کے معاشی مسئلہ پر بحث اس سے پہلے گزر چکی ہے۔

سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک عورت نے صحیح بات کہی ہے۔ عمرؓ کا فیصلہ غلط تھا۔[1]

احادیث میں زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع تو نہیں کیا گیا ہے البتہ اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ مہر کی مقدار کم رکھی جائے۔ ایک حدیث میں ہے:۔

ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ[2] — سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس کا بوجھ ہلکا ہو۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ دورِ رسالت میں مہر کی مقدار کم رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہم لوگوں کا مہر دس اُوقیہ یعنی چار سو درہم ہوا کرتا تھا۔[3]

خود ازواجِ مطہرات کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ یعنی پانچ سو درہم تھا۔[4]

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مہر بہت زیادہ مت رکھو، اس لیے کہ اگر مہر کی زیادتی دنیا میں عزت کی اور آخرت میں تقویٰ اور خدا ترسی کی دلیل ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق تھے کہ آپ زیادہ مہر رکھتے لیکن آپ کی بیویوں اور بیٹیوں میں سے کسی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں تھا۔[5]

ایک انصاری نے چار اوقیہ یعنی دو سو درہم مہر مقرر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ پہاڑ چاندی کا ہے اور تم اس سے چاندی تراش تراش کر لے آتے ہو۔[6]

اب سوال یہ ہے کہ کم سے کم مہر کی مقدار کیا ہو سکتی ہے؟ شریعت نے اس کی کوئی حد متعین کی ہے یا نہیں؟ اس پر فقہاء کا قریب قریب اجماع ہے کہ مالی قدر و قیمت رکھنے والی چیز ہی مہر ہو سکتی ہے۔ جس چیز کی مالی لحاظ سے کوئی قیمت نہ ہو وہ مہر نہیں بن سکتی۔ اس کے ذریعہ نکاح جائز نہیں ہے۔[7] اس لیے کہ قرآن نے صاف صاف الفاظ میں کہا ہے۔

---

[1] فتح الباری ۹/۱۶۱ [2] مسند احمد: ۶/۸۲ [3] نسائی، کتاب النکاح، باب القسط فی الاصدقہ

[4] مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق الخ۔ ابوداؤد، کتاب النکاح باب الصداق۔ نسائی حوالہ سابق۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح باب صداق النساء۔

[5] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب الصداق۔ ترمذی، ابواب النکاح، باب ما جاء فی مہور النساء۔ نسائی، کتاب النکاح، باب القسط فی الاصدقہ۔

[6] مسلم، کتاب النکاح، باب ندب من اراد نکاح امرأۃ، الخ [7] اس سے ایک ابن حزم نے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک دلیل حاشیہ اگلے صفحہ پر

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ (النساء: ۲۴)

حلال کی گئی ہیں تمہارے لیے ان کے سوا (محرمات کے سوا) سب ہی عورتیں کہ تم ان کو اپنے مالوں کے بدلے چاہ سکتے ہو۔ (نکاح کرسکتے ہو)

قرآن مجید نے مطلقاً 'اموال' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لیے فقہاء کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ وہ جس طرح زیادہ سے زیادہ ہوسکتا ہے، اسی طرح کم سے کم بھی ہوسکتا ہے۔ جب تک کوئی چیز اتنی حقیر مقدار کو نہ پہنچ جائے کہ اس کی مالیت ختم ہوجائے اور اس پر مال کا اطلاق ہی نہ ہوسکے، اس میں مہر بننے کی صلاحیت موجود ہوگی۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ یہ رائے علماء سلف وخلف کی اکثریت کی ہے۔ اس میں یحییٰ بن سعید، ابو الزناد، ربیعہ، ابن جریج، مسلم بن خالد، امام لیث، امام ثوری، ابن ابی لیلیٰ، امام شافعی، داؤد ظاہری، فقہاء اہل حدیث اور ابن وہب مالکی وغیرہ شامل ہیں۔[1]

اس کے برعکس امام ابوحنیفہ، امام مالک، سعید بن جبیر، امام نخعی، ابن شبرمہ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ شریعت نے مہر کی کم سے کم مقدار متعین کردی ہے۔ اس سے بھی کم کردینا صحیح نہیں ہے[2]۔ البتہ ان حضرات کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ مہر کی کم سے کم مقدار شریعت نے کتنی رکھی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ مقدار دس درہم ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کی مقدار ربع دینار یا تین درہم ہے۔ ابن شبرمہ نے اس کی مقدار پانچ درہم مانی ہے۔ امام نخعی سے ۴۰ درہم اور دس درہم دونوں طرح کی روایتیں منقول ہیں[3]۔

امام شافعی اور ان کے ہم خیال فقہاء کی ایک دلیل قرآن مجید کی آیت بھی ہے۔

(بقیہ گذشتہ حاشیہ)
ایک دانۂ گندم بھی مہر ہوسکتا ہے۔ مہر کے لیے کسی چیز کا مالی قیمت رکھنا ضروری نہیں ہے۔ (نیل الاوطار ۶/۳۱۰ - ۳۱۱)

[1] نووی: شرح مسلم ۱/۴۵۷

[2] اس کی تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش کی گئی ہے۔ قد علمنا ما فرضنا علیھم فی ازواجھم (الاحزاب: ۵۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ مہر کو واجب کیا ہے بلکہ اس کی حد بھی متعین کردی ہے۔ اب ہمیں ان دونوں ہی باتوں میں اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اگر کوئی شخص صرف ایجاب مہر کو مانتا ہے اور اس کے تعین کو نہیں مانتا تو وہ اس آیت کے منشا کو رد کرتا ہے۔ الکفایۃ علی الہدایۃ ۲/۵۹ اس آیت سے یہ استدلال میرے خیال میں بہت زیادہ واضح اور مستحکم نہیں ہے۔

[3] تفصیل کے لیے دیکھئے نووی شرح مسلم ۱/۴۵۷، ابن حجر فتح الباری ۹/۱۷۰

فما استمتعم بہ منھن فاتوھن اجورھن فریضۃ (النساء: ۲۴) پھر تم نے ان عورتوں میں سے جن سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کے طے شدہ مہر ادا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ مہر ایک معاوضہ ہے جو عورت سے استفادہ کے بدلے میں مرد پر واجب ہوتا ہے۔ معاوضہ کو باہمی رضامندی سے طے ہونا چاہیے، ورنہ وہ معاوضہ نہیں رہے گا۔ مہر کی مقدار اگر پہلے سے متعین کر دی جائے تو اس سے معاوضہ کا تصور نکل جائے گا اور قرآن کا منشا پورا نہ ہوگا۔

اس گروہ کی دوسری دلیل بخاری و مسلم کی ایک روایت ہے جس میں آتا ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں اپنی ذات کو آپ کے لیے ہبہ کرتی ہوں۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ اس کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیں۔ وہ دیر تک کھڑی رہی لیکن آپ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ کی خاموشی کو دیکھ کر ایک شخص نے عرض کیا۔ حضور! اگر آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے تو اس کا نکاح مجھ سے کر دیجئے۔ آپ نے اس سے دریافت کیا، کیا تمہارے پاس مہر دینے کے لیے کچھ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ اپنے اس تہمد کے علاوہ اور کوئی بھی چیز میرے پاس نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تم اپنا تہمد اسے دیدو گے تو تمہارے پاس تہمد نہیں رہے گا۔ جاؤ اپنے گھر اور کوئی چیز لے آؤ۔ اس نے کہا حضور! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا جاؤ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی لے آؤ۔ اس نے اِدھر اُدھر کوشش کی لیکن وہ بھی اسے نہیں ملی۔ آپ نے فرمایا اچھا تو بتاؤ کیا تمہیں قرآن کا کوئی حصہ یاد ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں! فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں۔ آپ نے فرمایا تمہارے پاس جو قرآن ہے اس کے عوض میں نے تمہارا نکاح اس سے کر دیا۔[1]

اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ مہر کی کمی کی کوئی حد نہیں ہے[2] زوجین اگر راضی ہوں تو مہر چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ہو سکتی ہے جیسے ایک کوڑا، جوتا، لوہے کی انگوٹھی یا اس جیسی کوئی چیز۔[3] جو لوگ مہر کی کم سے کم مقدار کو متعین سمجھتے ہیں انھوں نے اس کا جواب دیا ہے اور اپنی تائید

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز کونہ تعلیم قرآن وخاتم حدید الخ

[2] ابن حجر فرماتے ہیں لاحد لاقل المھر۔ فتح الباری ۹/۱۶۵

[3] نووی: شرح مسلم ۱/۴۵۷

میں بعض دوسرے دلائل پیش کیے ہیں۔ یہاں ہم احناف کے بعض دلائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

احناف نے پہلی دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ مہر کی نوعیت زوجین کے درمیان طے ہونے والے محض ایک معاوضہ کی نہیں ہے بلکہ اس میں عبادت کا پہلو بھی ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی معاوضہ فریقین کی مرضی سے ختم کیا جا سکتا ہے لیکن مہر کو میاں بیوی اپنی مرضی سے ختم نہیں کر سکتے[1]

مذکورہ بالا حدیث کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وَلَوْ خاتَماً مِنْ حَدِيدٍ (لوہے کی ایک انگوٹھی ہی سہی) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فی الواقع لوہے کی انگوٹھی مہر بن سکتی ہے بلکہ یہ ایک انداز بیان ہے کہ جو مہر بھی تم دے سکتے ہو دو اور اس کی کم سے کم مقدار معلوم و متعین تھی۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں 'مہر معجل' کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اس وقت مہر کا جو حصہ بھی ادا کر سکتے ہو اسے ادا کر دو، باقی تمہارے ذمہ واجب ہوگا' اس کی تائید میں یہ بات پیش کی گئی ہے کہ مہر معجل کا دور اول میں رواج عام تھا اور اس کی بہت اہمیت محسوس کی جاتی تھی۔ تیسری توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ معاملہ صرف اس شخص کے ساتھ خاص تھا' یہ دوسروں کے لیے نمونہ نہیں ہے۔ اس کی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے — چوتھی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ اس شخص کو قرآن شریف کی کئی سورتیں یاد ہیں تو آپ نے اس کی عزت کے باوجود اس عورت کا نکاح اس سے کر دیا اور مہر طے نہیں کیا۔ لیکن 'مہر مؤجل' اس پر خود بخود فرض ہو گیا جو اس کو بعد میں ادا کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن یہ سب تاویلیں بہت کمزور ہیں اور حدیث کے بیان پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتیں[2]

احناف کے مسلک کی بنیاد بیہقی کی ایک روایت ہے۔

لا مهر دون عشرة دراهم — مہر کی مقدار دس درہم سے کم نہیں ہو سکتی۔

اس کی تائید حضرت علی کی ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس کو دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

لا صداق اقل من عشرة دراهم[3] — مہر دس درہم سے کم نہیں ہو سکتا۔

---

[1] بدایۃ المجتہد ۲ [2] تفصیل کے لیے دیکھیے، فتح الباری ۹/ ۱۶۷ - ۱۶۸

[3] سنن دارقطنی، کتاب النکاح، باب المہر۔ سنن بیہقی ۷/ ۲۴۰ مطبوعہ حیدرآباد ۔۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جن لوگوں نے مہر کی مقدار متعین سمجھی ہے انھوں نے 'قطعِ ید' کے نصاب پر بھی قیاس کیا ہے۔ احناف کے نزدیک 'قطعِ ید' کا نصاب دس درہم ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ مہر کا نصاب بھی کم از کم دس درہم ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ نصاب ظاہر کرتا ہے کہ دس درہم سے کم قیمت کی مالیت کسی محترم عضو کو حلال نہیں کرتی۔ لیکن ایک تو 'قطعِ ید' کا یہ نصاب متفق علیہ نہیں ہے[1]۔ دوسرے یہ کہ عورت سے استمتاع کو قطعِ ید پر قیاس کرنا بہت دور کا بلکہ صحیح معنے میں ایک بے بنیاد قیاس ہے۔ 'قطعِ ید' ایک جرم کی سزا ہے اور اس کی وجہ سے آدمی میں نقص پیدا ہو جاتا ہے لیکن عورت سے استمتاع میں نہ تو سزا کا کوئی تصور ہے اور نہ اس سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ باہمی مودت اور ایک خاص جذبے کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ دونوں کے درمیان قیاس کی کوئی مشترک بنیاد نہیں ہے[2]۔

احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں مہر کی مقدار دس درہم سے کم بھی رہی ہے۔ اس لیے دس درہم اس کا نصاب مقرر کر دینا صحیح نہیں ہے۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں دی

یہ دونوں حدیثیں محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں۔ حضرت علیؓ کی روایت موقوف ہے کیونکہ اس کو حضرت علی سے شعبی نے روایت کیا ہے اور دونوں میں ملاقات ثابت نہیں ہے۔ نیز اس کے ایک راوی داؤد اودی کو بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ پہلی حدیث کا ایک راوی مبشر بن عبید ہے جس کو محدثین نے متروک الحدیث کہا ہے۔ امام احمد نے اس کی روایات کو موضوع بتایا ہے۔ مبشر بن عبید نے اس حدیث کو حجاج بن ارطاۃ سے روایت کیا ہے۔ حجاج بن ارطاۃ کی روایات بھی محدثین کے نزدیک قابلِ حجت نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو تحفۃ الاحوذی ۲/۱۸۳ دارقطنی مع التعلیق المغنی ص ۳۹۲

مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے حجاج بن ارطاۃ کی کئی جگہ تحسین کی ہے۔ جن وجوہ سے محدثین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے وہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ حدیث کے اس فقرے کو ابن ابی حاتم نے ایک لمبی حدیث کے ذیل میں بھی روایت کیا ہے۔ اس روایت میں یہ دونوں راوی نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ روایت میرے نزدیک حسن کے درجے سے نہیں ہے۔ فیض الباری ۴/۲۹۰، ۲۹۱۔

[1] مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ قطعِ ید کا نصاب بھی مہر ہی کے نصاب کی طرح عہدِ رسالت کے آغاز میں بہت کم تھا لیکن بعد میں دس درہم متعین ہو گیا۔ فیض الباری ۴/۲۹۱

[2] ابن رشد، بدایۃ المجتہد ۲/۱۹، ۲۰۔

جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ایک انصاری عورت سے شادی کی اور ایک نواۃ سونا اس کا مہر مقرر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا ' بارک اللہ ' ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی ذبح کرو[1]

' نواۃ ' کھجور کی گٹھلی کو کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ پانچ درہم کے لیے استعمال کیا جاتا تھا[2]۔

۲۔ عامر بن ربیعہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے بنو فزارہ کی ایک عورت سے شادی کی اور مہر میں صرف ایک جوڑا جوتے دیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت سے پوچھا کہ کیا اس مہر سے تم خوش ہو اور اس کے نکاح میں آنے کے لیے تیار ہو۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے اس نکاح کو جائز قرار دیا[3]

۳۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ایک شخص مہر میں اپنی بیوی کو ایک مٹھی غلہ دے اور وہ اس پر راضی ہو جائے تو نکاح جائز ہے[4]۔

ان میں سے پہلی روایت تو صحاح کی سب ہی کتابوں میں موجود ہے اس لیے اس کی صحت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ بعد کی روایتوں میں کسی قدر ضعف ہے۔ لیکن تعیینِ مہر کے سلسلے میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں ان سے وہ بہر حال قوی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی تائید بعض دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ کم یا زیادہ مہر مقرر کریں، وہ جس مقدار پر بھی متفق ہو جائیں صحیح ہے۔ چاہے وہ بہت ہی حقیر اور معمولی کیوں نہ ہو[5]

---

[1] بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب الولیمۃ ولو بشاۃ۔ مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق، الخ

[2] ابن الاثیر:۔ النہایۃ فی غریب الحدیث ۴/۱۸۲ ' نواۃ من ذہب ' کے معنے میں اختلاف ہے لیکن کسی نے بھی دس درہم اس کے معنے نہیں بتائے ہیں۔ اوپر ہم نے راجح قول کا ذکر کیا ہے۔ ابن حجر فتح الباری ۹/۱۸۵۔ ۱۸۲

[3] مسند احمد ۳ ۴۴۵۔ ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی مہور النساء۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب صداق النساء۔

[4] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب قلۃ المہر۔ [5] اس سلسلے کی کئی روایتیں دارقطنی میں موجود ہیں۔ (کتاب النکاح، باب المہر ص ۳۹۱۔ ۳۹۲) لیکن ان سب روایتوں میں ضعف پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے مہر کی مقدار متعین نہیں کی ہے، بلکہ اس کو ہر دور کے حالات، زوجین کی معاشی و سماجی حیثیت ان کی خاندانی روایات، باہمی تعلقات، آپس کے اعتماد اور عورت کی ضروریات پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ چاہیں تو کم سے کم مہر بھی طے کر سکتے ہیں اور اس کی بھی انھیں اجازت ہے کہ وہ اپنے حالات کے تحت اس کی مقدار زیادہ رکھیں۔ قرآن مجید سے بھی یہی رہنمائی ہمیں ملتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء: ۲۵)	ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرو اور دستور کے مطابق ان کے مہر دو۔

یہاں 'اجور' کے معنے مہر لیے گئے ہیں اور اس کو معروف کا پابند بنایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آیت میں آزاد عورتوں کے مہر کا ذکر نہیں بلکہ لونڈیوں کے مہر کا ذکر ہے اور ہمارے علماء کی اکثریت کی رائے میں لونڈیاں اپنے مہر کی مالک نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے آقا اس کے مالک ہوتے ہیں لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ شریعت مہر کے معاملے کو معروف کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ 'معروف' سے مراد یہاں کسی بھی زمانے کا وہ رسم و رواج ہے جس کو عام طور سے پسندیدہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور جو شریعت کے کسی واضح حکم یا اس کے مزاج سے نہ ٹکرائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر کی جس مقدار کو معقول اور مناسب سمجھا جائے اور اس کے نامناسب ہونے کا احساس نہ پایا جائے وہی صحیح مہر ہے۔ اس میں عورت اور مرد دونوں کی حیثیت کی بھی رعایت ہونی چاہیے اور زمانہ اور حالات کی بھی۔ ورنہ وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔

مہر کے سلسلے میں ایک بحث یہ بھی رہی ہے کہ 'مال' کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے۔ احناف کے نزدیک اس کا اطلاق نقد پر ہوتا ہے، یا ان چیزوں پر جو اپنی مالیت رکھتے ہیں۔ منافع کے لیے وہ بولا نہیں جاتا۔ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ ان تبتغوا باموالکم (اپنے مالوں کے ذریعہ ان کو طلب کرو) سے صریح طور پر دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ مہر وہی چیز ہوگی جس کو مال کہا جا سکے اور عورت جس کی مالک بن سکے۔ دوسرے یہ کہ مہر کو عورت کے حوالے کیا جانا چاہیے، تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ 'منافع' میں یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ نہ تو اس کو عورت کے حوالے کیا جاتا ہے اور نہ وہ

اس کی مالک ہی ہوتی ہے۔ مہر سے متعلق قرآن کی ایک اور آیت ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً	عورتوں کو ان کے مہر خوشی دو۔ پھر اگر خوش دلی
فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ	سے وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو تم مزے سے
نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا (النساء: ۴)	کھا سکتے ہو۔

'عورتوں کو ان کے مہر دو' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ مہر دینے کا مطلب عورت کو کسی بھی نوعیت کا فائدہ پہنچانا نہیں ہے بلکہ کسی مادی چیز کا دینا ہے۔ فائدہ پہنچانے کو دینا نہیں کہا جائے گا۔ پھر (تم مزے سے کھا سکتے ہو) کے الفاظ مزید وضاحت کر رہے ہیں کہ مہر کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو کھائی جا سکے، یا جس سے کھائی جانے والی چیز حاصل کی جا سکے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا مہر یہ مقرر کرے کہ وہ اس کو قرآن کی تعلیم دے دے گا تو یہ مہر صحیح نہ ہو گا۔[1] ویسے بھی متقدمین احناف کے نزدیک قرآن کی تعلیم پر اجرت لینا یا منافع حاصل کرنا صحیح نہیں ہے۔[2]

امام شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم پر اجرت بھی لی جا سکتی ہے اور وہ مہر بھی بن سکتی ہے۔[3] ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو اوپر گزر چکی ہے جس میں آپ نے فرمایا :۔

اذهب فقد انكحتكها بما معك	جاؤ میں نے تمہارا نکاح اس سے کرا دیا ہے۔
من القرآن[4]	اس قرآن کی وجہ سے جو تمہارے پاس ہے۔

ایک اور روایت ہے :۔

فقد زوجتكها فعلمها من	میں نے تمہارا نکاح اس سے کر دیا تم اس کو
القرآن[5]	قرآن کا کچھ حصہ سکھا دو۔

---

[1] جصاص : احکام القرآن - ۲/۱۰۲
[2] تفصیلی دلائل کے لیے ملاحظہ ہو۔ طحاوی : شرح معانی الآثار -
[3] نووی : شرح مسلم ۱/۴۵۶
[4] بخاری - کتاب النکاح ؛ باب التزویج علی القرآن ولغیر صداق
[5] مسلم کتاب النکاح باب الصداق وجواز کونہ تعلیم القرآن الخ

بعض اور روایتوں میں اس کی تفصیل بھی ملتی ہے کہ تم اتنی آیتوں کی اسے تعلیم دے دو متاخرین احناف[1] نے ان دونوں باتوں میں امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک قبول کر لیا ہے۔ وہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا بھی صحیح سمجھتے ہیں اور اسے بطور مہر طے کرنا بھی ان کے نزدیک صحیح ہے[1]۔ اس طرح یہ مسئلہ علماء کے درمیان بڑی حد تک متفق علیہ بن گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر نقد بھی ہو سکتا ہے۔ زمین، باغ، مکان یا کوئی قیمتی چیز بھی ہو سکتی ہے اور عورت چاہے تو یہ بھی طے کر سکتی ہے کہ اسے بجائے ان مالیت رکھنے والی چیزوں کے تعلیم دلا دی جائے، یا کوئی پیشہ سکھا دیا جائے۔

مطلقہ کا مہر

مہر کے بعض احکام کا تعلق طلاق سے بھی ہے۔ ذیل میں اس کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ طلاق یا تو خلوت صحیحہ کے بعد ہوگی یا خلوت صحیحہ سے پہلے۔ دونوں صورتوں میں یا تو مہر متعین ہوگا، یا نہیں ہوگا۔ اس طرح طلاق چار مختلف حالتوں میں ہو سکتی ہے[2]۔ ان سب کے احکام الگ ہیں۔

۱۔ طلاق خلوت صحیحہ کے بعد دی جائے اور مہر متعین ہو تو پورا مہر ادا کرنا ہوگا۔ ارشاد ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۔ عورتوں کو ان کے مہر عطیہ کے طور پر دو۔
(النساء: ۴)

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (البقرہ: ۲۲۹)
تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو (مہر) تم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو۔

۲۔ طلاق خلوت صحیحہ کے بعد دی جائے اور مہر متعین نہ ہو تو مہر بہر حال دینا ہوگا اس لئے کہ عورت سے استمتاع کے بعد مہر لازم ہو جاتا ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً (النساء: ۲۴)
پھر ان میں سے جن عورتوں سے تم نے فائدہ اٹھایا ان کے مہر انھیں دو جو تم پر فرض ہیں۔

---

[1] رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۴۵۹ [2] حوالہ سابق ۲/ ۴۶۳۔ نیز ملاحظہ ہو شرح وقایہ ۲/ ۳۸-۳۹

مہر کی مقدار متعین نہ ہو تو میاں بیوی باہم رضامندی سے اس کی مقدار متعین کر سکتے ہیں۔ اگر ان میں اختلاف ہو تو مہر مثل واجب ہوگا۔ یعنی اس عورت کے خاندان کی دوسری عورتوں کا جو مہر ہوگا وہی اس کا مہر ہوگا۔[1]

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ شبہ میں کسی عورت سے ہم بستری ہو جائے تو مہر مثل واجب ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر جس عورت سے باقاعدہ نکاح ہو بدرجہ اولیٰ اس کا مہر مثل واجب ہونا چاہیے۔[2]

۳۔ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی گئی لیکن مہر متعین ہو چکا تھا تو اس صورت میں نصف مہر دیا جائے گا۔ قرآن نے اس کی صراحت کی ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ	اگر تم نے ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی،
تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ	اور تم ان کا مہر مقرر کر چکے تھے تو جو مہر مقرر کیا
فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ	تھا اس کا آدھا ہوگا۔ ہاں اگر وہ درگزر کریں
اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ	(اور اس سے کم لیں) یا وہ شخص جس کے ہاتھ
بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَاَنْ تَعْفُوْٓا	میں نکاح کی گرہ ہے (یعنی شوہر) درگزر کرے
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَنْسَوُا	(اور زیادہ دے تو ایسا کر سکتا ہے) اگر تم عفو
الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا	درگزر سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝	بات ہوگی۔ آپس میں احسان کرنا نہ بھولو۔ بے شک
(البقرہ: ۲۳۷)	جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔

۴۔ خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی گئی لیکن مہر متعین نہیں ہوا تھا تو اسے 'متاع' دیا جائے گا۔ قرآن نے اس کے مہر کا ذکر نہیں کیا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ	اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نے عورتوں
النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا	کو اس وقت طلاق دی جبکہ ابھی تم نے نہ تو

---

[1] حوالہ سابق ص ۲۶۰ [2] تفسیر کبیر ۲/ ۲۹۲

لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (البقرہ: ۲۳۶)

ان کو ہاتھ لگایا اور نہ ان کا مہر مقرر کیا۔ اس صورت میں ان کو کچھ متاع دو۔ صاحب حیثیت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔ متاع معروف کے مطابق ہو۔ احسان کرنے والوں پر یہ لازم ہے۔

ان چار صورتوں کے علاوہ ایک اور صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ خلوتِ صحیحہ سے پہلے مرد کا انتقال ہو گیا اور مہر بھی متعین نہیں تھا تو امام مالک اور امام اوزاعی وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ اس عورت کو مہر نہیں ملے گا، متعہ دیا جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بیوی سے شوہر جو جنسی تعلق قائم کرتا ہے مہر اس کا عوض ہے۔ جب یہ تعلق ہی قائم نہیں ہوا تو مہر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ اسے شوہر کے مال میں میراث ملے گی۔ امام شافعی کی بھی معروف رائے یہی ہے۔

لیکن امام ابو حنیفہ اور امام احمد وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ عورت کو مہر مثل ملے گا اور میراث بھی ملے گی۔ اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اسی مسئلہ میں سوال کیا گیا کہ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا۔ اس نے بیوی کا نہ تو مہر مقرر کیا تھا اور نہ اس کے ساتھ اس کی خلوت ہوئی تھی۔ آپ نے جواب دیا کہ اس کا مہر وہ ہوگا جو اس کے خاندان کی دوسری عورتوں کا مہر ہے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ اسے عدت بھی پوری کرنی ہوگی۔ اسے میراث بھی ملے گی۔ معقل بن سنان اشجعیؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس فتویٰ کی تائید میں فرمایا کہ ہمارے قبیلہ کی ایک عورت بروع بنت واشق کا یہی معاملہ تھا اور رسول اللہؐ نے بالکل یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بہت خوش ہوئے[1]۔

اس حدیث پر جرح بھی کی گئی ہے لیکن یہ جرح صحیح نہیں ہے۔ امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنی کہتے ہیں کہ یہ حدیث ثابت ہو جائے تو اس کے مقابلہ میں کسی کی رائے قبول نہیں کی جائے گی[2]۔ حدیث چونکہ صحیح ہے اس لیے امام ابو حنیفہؒ ہی کا مسلک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یتزوج المرأة الخ۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب من تزوج ولم یسم صداقا حتی مات۔ [2] بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۹

اگر خلوت سے پہلے عورت کا انتقال ہو جائے اور مہر متعین نہ ہو تو اس کا بھی فقہ حنفی کی رو سے یہی حکم ہے[۱]

عورت کو مہر میں تصرف کا حق ہے

قرآن مجید نے ایک طرف تو کہا کہ مہر عورت کا حق ہے، پہلے اس کے اس حق کو تسلیم کیا جائے۔ اس کے بعد وہ چاہے تو اپنے اس حق کو پورا پورا بھی وصول کر سکتی ہے، اس سے کچھ کم بھی لے سکتی ہے اور اسے معاف بھی کر سکتی ہے، دوسری طرف مرد سے کہا کہ اگر عورت بخوشی اپنے مہر کا کچھ حصہ واپس کر دے تو بڑے شوق سے تم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ارشاد ہے:۔

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ	اگر وہ بخوشی اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو تم
نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا (النساء: ۴)	مزے سے اسے کھا سکتے ہو۔

اس آیت نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی کہ مہر عورت کی ملکیت ہے۔ اسے اس سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی ملکیت میں آزادی سے تصرف کر سکتی ہے۔ اگر وہ بطیب خاطر اس میں سے کچھ دے تو شوہر اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کے جبر کی وجہ سے یا اس کے ظلم وستم سے ڈر کر اسے دے رہی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ بعض علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ عورت مہر معاف کر دے اور بعد میں اس سے رجوع کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نے خوش دلی سے یہ اقدام نہیں کیا تھا۔[۲]

شعبی کہتے ہیں کہ قاضی شریح کے پاس ایک عورت آئی۔ اس کے ساتھ اس کا شوہر بھی تھا اس نے اسے ایک عطیہ دیا تھا جسے وہ واپس لینا چاہ رہی تھی۔ قاضی شریح نے شوہر سے کہا کہ اسے واپس کر دو۔ شوہر نے مذکورہ بالا آیت کا حوالہ دے کر کہا کہ عطیہ دینے کے بعد

---

[۱] رد المحتار علی الدر المختار ۲/۳۶۰ [۲] تفسیر کبیر ۳/۱۲۶

اسے واپس لینے کا حق نہیں ہے ۔ قاضی شریح نے کہا کہ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ وہ خوش دلی سے دے تو تم لو ۔ اگر وہ خوش دلی سے دیتی تو واپس نہ مانگتی ۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے قاضیوں کو لکھا کہ عورتیں رغبت سے بھی اور خوف سے بھی (مہر) دے دیتی ہیں ۔ اگر عورت مہر دینے کے بعد پھر رجوع کرنا چاہے تو اسے اس کا حق حاصل ہوگا[1]

ویسے فقہاء ابو اسے صحیح نہیں سمجھتے کہ زوجین میں سے کوئی دوسرے کو عطیہ دینے کے بعد اسے واپس لے[2] لیکن یہ ایک قانونی بحث ہے ۔ اتنی بات طے ہے کہ عورت جو بھی دے، خوش دلی سے دے، اس میں جبر واکراہ صحیح نہیں ہے ۔

ایک دوسری جگہ فرمایا :-

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِنۢ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ؕ (النساء : ۲۴)	اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ مہر کے مقرر ہونے کے بعد تم آپس کی رضامندی سے اس کے بارے میں کوئی چیز طے کرلو ۔

عورت اور مرد کی رضامندی سے مہر میں کمی بھی ہوسکتی ہے اور زیادتی بھی، ادائیگی میں عجلت بھی ہوسکتی ہے اور تاخیر بھی معافی بھی ہوسکتی ہے اور تبدیلی بھی ۔ مثلاً مہر میں باغ متعین تھا، اس کی جگہ مکان لے لیا[3]

ان سب باتوں کا تعلق میاں بیوی کے روابط، دونوں کے ایک دوسرے پر اعتماد اور ان کے حالات پر ہے ۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے اسے ان کی رضامندی پر چھوڑ دیا ہے ۔ ایک فرض کی ادائیگی میں اس سہولت اور گنجائش کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں جو خوش گوار فضا پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے ۔

---

[1] حوالہ سابق ۔ [2] ابن ہبیرہ : الافصاح ۲/۵۹ ۔

[3] مہر کی زیادتی کے بارے میں امام شافعی کو اختلاف ہے ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ۔ جصاص : احکام القرآن ۲/۱۶۹ - ۱۸۹ ۔

تعدّد ازواج

اسلام کے نزدیک تعدّد ازواج (Polygamy) غلط اور ناجائز نہیں ہے بلکہ وہ بعض شرائط کے ساتھ جائز سمجھتا ہے۔ اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت وحدتِ ازواج (Monogamy) کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ بیک وقت کئی کئی بیویاں رکھے۔ یہ عورت کے ساتھ بہت بڑی زیادتی بھی ہے کہ آدمی ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری کو اپنے گھر لے آئے اور وہ اس کی حریف اور مدّمقابل کی حیثیت سے زندگی بھر اس کے ساتھ لگی رہے۔ چنانچہ بہت سے ممالک نے اس 'ظلم وزیادتی' کو روکنے کے لئے تعدد ازواج پر قانونی پابندی عائد کر رکھی ہے، بعض ممالک میں اس پر قانونی پابندی تو نہیں ہے لیکن اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس وقت شاید کم ہی ملک ایسے ہوں گے جہاں اُ ن میں قانونی اور اخلاقی طور پر کوئی قباحت نہ محسوس کی جاتی ہو۔

تعدد ازواج کے مسئلہ میں پہلے تو یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس کے لئے صرف اسلام کو ہدف تنقید بنانا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ کوئی جرم ہے تو اس کا ارتکاب صرف اسلام نے نہیں کیا ہے۔ اس سے پہلے دنیا کی بیشتر قوموں میں اس کا رواج تھا۔ مختلف مذاہب کی قانونی سند اور اخلاقی جواز اسے حاصل تھا اور اسے کوئی جرم یا گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ البتہ راہبانہ مذاہب میں تعدد ازدواج کیا معنی ازدواجی زندگی ہی کو ناپسند کیا جاتا تھا، عیسائیت کا فروغ ایک راہبانہ مذہب کی حیثیت سے ہوا۔ یہاں دیندار آدمی کے لیے ایک بیوی کی بھی بدرجہ مجبوری اجازت تھی۔ مغرب اپنی بے دینی اور الحاد کے دعویٰ کے باوجود عیسائیت کے اثر سے آزاد نہیں ہوا۔ اس نے ایک زوجگی کے تصور کو تو گوارہ کر لیا لیکن تعدد ازواج کا تصور اس کے

حلق سے نیچے نہیں اتر سکا۔ جن قوموں کی گردن میں مغرب کا طوقِ غلامی تھا انھوں نے اس کی تائید اٹ ت کرنی شروع کر دی جیسے پہلی مرتبہ آنکھیں کھلی ہوں اور عورت کی عظمت کا احساس ہوا ہو۔

تعدد ازواج کی طرف مرد کا رجحان

پہلے اسے آپ ایک مرد کے نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ایک مرد ایک ہی بیوی رکھتا ہے۔ لیکن تعدد ازواج کو اس کی فطرت کے خلاف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنھوں نے فطرت کا مطالعہ بھی مغرب کی عینک سے کیا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد کے اندر فطری طور پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رجحان ہے۔ وہ اگر ایک بیوی پر قانع بھی رہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے اندر اس کی خواہش نہیں ہے۔ جن لوگوں کے اندر اس کا شدید رجحان ہے اگر تعدد ازواج کی اجازت نہ ہو تو، اندیشہ ہے کہ وہ کسی غلط اور ناجائز طریقہ سے اس کی تسکین کا سامان ڈھونڈنے لگیں گے۔ چنانچہ مغرب کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ اس نے تعدد ازواج کو رد کیا تو زنا اور بے ضابطہ جنسی تعلق کو اسے برداشت کرنا پڑا۔ آج وہاں قانوناً آدمی کی ایک ہی بیوی ہے لیکن داشتائیں بہت ہیں اور وہ ان تمام حقوق سے محروم ہیں جو ایک بیوی کو از روئے قانون حاصل ہیں۔

تعدد ازواج مرد کی ایک ضرورت

تعدد ازواج کی طرف مرد کا رجحان ہی نہیں بلکہ بعض اوقات یہ اس کی ایک ضرورت بھی بن جاتا ہے۔ جنسی خواہش ایک فطری خواہش ہے۔ جن افراد میں یہ خواہش بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور جو اس پر قابو نہیں پاتے ان کے لیے ایک عورت کافی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت حیض، نفاس، حمل اور رضاعت سے مسلسل گزرتی رہتی ہے۔ ان حالات میں اس کے جنسی جذبات کمزور پڑ جاتے ہیں اور وہ مرد کے جذبات کا پوری طرح ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان ایام میں جنسی تعلق رکھنے میں بعض قباحتیں بھی ہیں۔ حیض اور نفاس کی حالت میں آدمی اس سے کراہت محسوس کرتا ہے اور یہ میاں بیوی کی صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ مدتِ حمل میں یہ تعلق بچہ کے لیے ضرر رساں ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ

حمل، بچہ کی ولادت اور رضاعت کی وجہ سے عورت کا نظام جسمانی بہت متاثر ہوتا ہے اور عورت جلد بوڑھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب کہ اس کے مقابلے میں مرد دیر تک جوان رہتا ہے ان وجوہ سے اگر کوئی شخص ایک بیوی پر قانع نہیں ہے اور دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہاں اس پر ضرور یہ پابندی عائد کی جانی چاہیے کہ وہ دونوں کے حقوق ادا کرے اور ان میں سے کسی کی حق تلفی نہ کرے۔

عورت کے لیے تعدد ازدواج کی افادیت

اب آپ اسے ایک عورت کے نقطۂ نظر سے دیکھیے۔ بعض اوقات تعدد ازدواج خود عورت کے حق میں بھی مفید ہو سکتا ہے۔

۱۔ انسان کے اندر اولاد کی خواہش بالکل فطری ہے۔ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہو اور اس سے اولاد نہ ہو رہی ہو تو اس کے سامنے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پہلی بیوی کے ساتھ ایک اور بیوی بھی رکھ لے۔ دوسری یہ کہ وہ پہلی کو طلاق دے کر دوسری سے شادی کر لے ظاہر ہے شاذ و نادر ہی کوئی عورت پہلی صورت کے مقابلہ میں دوسری کو ترجیح دے گی۔

۲۔ عورت دائم المریض ہو یا کسی ایسے نسوانی مرض میں مبتلا ہو کہ اس سے ازدواجی تعلق رکھنا مشکل ہو تو اس صورت میں کیا یہ بات اس کے حق میں مفید ہو گی کہ اسے طلاق دے کر مرد دوسری صحت مند عورت سے شادی کرے یا یہ بات کہ وہ اسے اپنے حبالۂ عقد میں رکھتے ہوئے دوسری سے نکاح کر لے؟

اس طرح کی صورتوں میں پہلی بیوی کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہو گی کہ شوہر کو اسے طلاق دینے پر قانوناً مجبور کیا جائے۔ یہ زیادتی اس وقت اور گھناؤنی ہو جاتی ہے جب کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو اور شوہر بھی اسے چھوڑنا نہ چاہتا ہو۔

تعدد ازدواج ایک سماجی ضرورت کی حیثیت سے

بعض حالات میں تعدد ازدواج سماج کی بھی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔

۱۔ عام طور پر مردوں اور عورتوں کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی قوم کو جنگ سے سابقہ پیش آتا ہے تو زیادہ تر اس کے مرد ہی کام آتے ہیں اور وہ بھی جواں سال اور صحت مند اس سے عورتوں کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ جوان عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں اور جو بے شادی شدہ ہوتی ہیں ان کے لیے مرد نہیں ملتے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ جو عورتیں بیوہ یا بے شادی شدہ ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ صورت بڑی خطرناک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہش غلط طریقے سے پوری کرنے پر مجبور ہوں اور ہوس پرستوں کا بآسانی شکار ہو جائیں۔ اس سے پورے معاشرہ میں بدکاری پھیلے گی اور اس کے خطرناک نتائج کا اسے سامنا کرنا پڑے گا۔ اُسے کوئی صالح معاشرہ برداشت نہیں کرسکتا۔

۲۔ قوموں کی زندگی میں افرادی قوت (Man Power) اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دفاع کے لیے، صنعتی و زراعتی پیداوار اور اس کی ترقی کے لیے سماجی و معاشرتی خدمات کے لیے اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ بعض خاص اور نازک حالات میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ افرادی قوت میں اضافہ کا ایک ذریعہ تعدد ازواج بھی ہے۔ اس لیے کہ عورت بالعموم چالیس پینتالیس سال کے بعد اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی جب کہ مرد ستّر سال کے بعد بھی اس قابل ہوتا ہے کہ عورت اس سے بارآور ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی بیوی کی جب اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے اس وقت اگر کوئی شخص دوسری سے شادی کرلے تو پھر سے اولاد کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جن قوموں کو افرادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے انھیں تعدد ازواج کی ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔

عورت ایک سے زیادہ شوہروں کی متحمل نہیں ہے

بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک مرد کو کئی بیویاں رکھنے کا حق ہے تو عورت کو بھی یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ ایک سے زائد شوہر رکھے۔

لیکن عورت کو یہ حق دے بھی دیا جائے تو شاید وہ اسے استعمال کرنے کی کبھی ہمت نہیں کرسکتی۔ ایک عورت کے کئی شوہروں (Polyandry) کا رواج بعض

غیر متمدن قبائل میں تو ہے لیکن متمدن دنیا نے اسے کبھی اختیار نہیں کیا متمدن انسانی سماج نے اسے اس طرح رد کر دیا ہے کہ اب اسے وہ کبھی قبول نہیں کر سکتا۔

عورت کی فطرت بتاتی ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی شوہر کی بیوی ہو سکتی ہے۔ چند شوہری اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

عورت پر خاندانی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے، حمل اور رضاعت کی تکلیفیں اسے اٹھانی پڑتی ہیں، بعض باہر کے کام انجام دینے پر بھی وہ مجبور ہوتی ہے اس لیے کئی مردوں کی جنسی خواہش کا پورا کرنا اس کے لیے بہت دشوار ہے، اس سے اس کی صحت کے برباد ہونے کا خطرہ ہے۔ اس سے بعض جنسی اور دماغی بیماریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ تجربہ بتاتا ہے کہ جن عورتوں سے ایک سے زیادہ مردوں کا تعلق ہوتا ہے ان میں جنسی بیماریاں عام ہوتی ہیں اور وہ خانگی زندگی کے لیے فٹ نہیں ہوتیں۔

ایک عورت کے کئی شوہر ہوں تو اس سے بعض سماجی و معاشرتی مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک مرد کی کئی عورتیں ہوں اور وہ ان سب سے تعلق رکھے تو سب اس سے بارآور ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ان میں سے جس سے بھی اولاد ہوگی اسی کی سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر ایک عورت کے کئی شوہر ہوں اور سب اس سے تعلق رکھیں تو ایک وقت میں وہ ان میں سے ایک ہی سے بارآور ہو سکتی ہے، اس لیے یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس سے بارآور ہوئی ہے اور اولاد کس کی ہے؟

اگر یہی بات متعین نہ ہو کہ بچہ کس کا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ کس کی طرف منسوب ہوگا۔ کون اس کے اخراجات برداشت کرے گا۔ اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کون لے گا۔ وہ کس کا وارث اور کون اس کا وارث ہوگا؟ اس طرح کے اور بھی سوالات ہیں جنھیں خاندان کے موجودہ نظام میں، جو مرد کی سربراہی میں قائم ہے، اور جسے دنیا نے خاندان کی صحیح شکل کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے، کبھی حل نہیں کیا جا سکتا۔

چند شوہری کے نظام سے معاشرہ پر بھی برے اثرات پڑ سکتے ہیں۔

۱۔ یہ مرد کی فطرت ہے، چاہے وہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو کہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے کے تعلق کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک عورت کا کئی افراد سے تعلق ہو تو ان کے درمیان حسد اور رقابت کا جذبہ ابھر آتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں اور بعض اوقات اس کے بڑے خوفناک نتائج بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان کی یہ کشمکش خود عورت کے لیے ناقابلِ برداشت اور اس کے سکون کو درہم برہم کرنے والی ہو سکتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہی دلیل تعدد ازواج کے بھی خلاف جاتی ہے، اس لیے کہ عورت بھی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ اس کے شوہر کے کئی بیویاں ہوں اور اس کی محبت میں سب شریک ہو جائیں۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے باوجود عورت کا ردعمل مرد کے ردعمل کی طرح زیادہ شدید نہیں ہوتا اور اس کے اتنے سنگین نتائج بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے میں حق بجانب تصور کرتی ہے۔

۲۔ عورت کے اندر اللہ تعالیٰ نے شرم و حیا کا جذبہ رکھا ہے۔ یہ جذبہ بالکل فطری ہے اور خود بخود اس کے اندر سے ابھرتا ہے۔ ہزار کوشش کے باوجود مغرب اسے ختم کرنے میں ابھی تک پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس جذبہ کی وجہ سے عورت اپنے جنسی جذبات کا مرد کی طرح آسانی سے اظہار نہیں کرتی بلکہ حتی الوسع انھیں چھپاتی ہے۔ عورت کے اس حجاب کا معاشرہ کو زبردست اخلاقی فائدہ پہونچتا ہے۔ وہ جنسی بے راہ روی کی طرف بے جھجک آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک سے زیادہ مردوں سے تعلق اس کی اس خوبی کو مجروح کر دیتا ہے اور وہ بتدریج بے حیا ہوتی چلی جاتی ہے، عورت اگر حیا کا لباس اتار دے تو معاشرہ بڑی تیزی سے جنسی آوارگی کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

تعدد ازواج عیاشی کے لیے نہیں ہے

اب آئیے اس اعتراض پر غور کیا جائے کہ تعدد ازواج بھی عیاشی ہی کی ایک صورت ہے، اس سے مرد کو جنسی ہوس رانی اور عیاشی کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں جاگیرداروں اور رئیسوں نے حرم سرائیں کھولیں اور عورتوں کے جھرمٹ میں زندگی

گزار دی۔ اسلام نے تعدد ازواج کو تسلیم کرکے اسی نظام کی تائید و توثیق کی ہے اور عیاشی کے دروازے کھول دیئے ہیں کہ آدمی جب چاہے جس عورت سے چاہے شادی کرلے اور چار کی گنتی پوری ہو جائے تو ایک کو طلاق دے کر دوسری کو لے آئے۔ جی چاہے تو سب کو خانہ بدر کرکے چار نئی دلہنوں سے عشرت کدہ آباد کرلے۔

یہ اعتراض یک زوجگی کے نظام (Monogamy) پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو ہر فصلِ بہار میں پرانی بیوی کو رخصت کرکے نئی بیوی لا سکتا ہے۔ بلکہ اس طرح گھر کی رونق بڑھانے کے لیے کسی موسم کے انتظار کی بھی شاید ضرورت نہیں ہے صرف من کی موج کافی ہے۔ لیکن یہ اعتراض وہی شخص کرسکتا ہے جو اس حقیقت سے آنکھیں بند کرلے کہ عیاش آدمی ہمیشہ غیر ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسے اپنی عیاشی سے غرض ہوتی ہے۔ وہ کسی قسم کا بوجھ اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے عیاشی کی زندگی گزارنی چاہی انھوں نے بے قید شہوت رانی اختیار کی۔ تعدد ازواج کیا معنی ازدواجی زندگی ہی کو ناپسند کیا۔ اگر اسے مارے باندھے اختیار بھی کیا تو ن . . کر حقوق نہیں ادا کیے۔ اسلام میں ازدواجی زندگی ذمہ داریوں سے گھری ہوئی ہے۔ تعدد ازواج سے یہ ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ اس نے اس پر اتنی پابندیاں عائد کی ہیں اور اتنے حدود و قیود رکھے ہیں کہ بغیر کسی حقیقی ضرورت کے آدمی ایک سے زیادہ شادی کی ہمت نہیں کرسکتا۔

قانونی اقدامات

اسلام جو ذہن و مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے وہ صحیح معنی میں پیدا ہو جائے تو عیاشانہ زندگی کو آدمی ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں کرسکتا۔ یہاں اس سے بحث نہیں صرف بعض ان قانونی اقدامات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اسلام نے تعدد ازواج کے سلسلے میں کیے ہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے تعدد ازواج کے ذریعہ عیاشی کی راہ کھولی نہیں بلکہ اس میں زبردست رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔

چار کی تحدید

اسلام سے پہلے تعدد ازواج کا عام رواج تھا۔ عرب میں بھی اس پر عمل تھا۔

بعض لوگ بکثرت شادیاں کرتے تھے اور اس میں بڑی زیادتیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ اسلام نے اسے چار تک محدود کر دیا۔ وہ تعدد ازدواج کو ایک شخصی اور سماجی ضرورت کی حیثیت سے تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی ایسی صورت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے جس میں آدمی کو چار سے زیادہ شادیاں کرنی پڑیں۔ اسے وہ ناجائز اور حرام ٹھہراتا ہے۔ جو شخص اس حد سے آگے بڑھے اسلامی قانون اس کے خلاف اقدام کرے گا۔ اس طرح غیر محدود بیویاں رکھنے کا جو طریقہ رائج تھا اس نے اس پر پابندی لگائی اور ایک حد سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

حکم نہیں صرف اجازت

۲۔ بعض لوگ تعدد ازدواج کا اس طرح ذکر کرتے ہیں جیسے اسلام نے اسے فرض قرار دے رکھا ہے اور مسلمان اس کے کسی حکم پر عمل کرے یا نہ کرے اس حکم پر ضرور عمل کرتا ہے۔ ایک عورت سے اس کا کبھی جی نہیں بھرتا، اس کا گھر ہمیشہ چار بیویوں سے آباد رہتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تو یہ عرض کرنا ہے کہ یہ خیال بالکل غلط اور سراسر بے بنیاد ہے۔ سارے مسلمان یا کم از کم ان کی اکثریت تعدد ازدواج پر عمل کرتی ہے مسلمانوں کی ہزاروں کی آبادی میں اس پر عمل کرنے والے شاید انگلیوں پر گنے جاسکیں گے۔ یہ صرف قیاس نہیں اعداد و شمار بھی اس مہمل خیال کی صاف تردید کرتے ہیں۔ ان سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ دیگر اقوام کا تناسب اس معاملہ میں مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ تعدد ازدواج کی اسلام نے اجازت دی ہے، حکم نہیں دیا ہے۔ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ ضرورت پر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس پر زندگی بھر عمل نہ ہو تو بھی آدمی گناہ گار نہ ہوگا اور اس کے تقویٰ اور دینداری میں بھی اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

تیسرے یہ کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی ہمت افزائی نہیں کی، اس کی ترغیب و تشویق نہیں دی، بلکہ اس کی پیچیدہ ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی تاکہ آدمی سوچ سمجھ کر یہ اقدام کرے، اسے محض لذت اور تفریح کا ذریعہ نہ سمجھ بیٹھے۔

چوتھے یہ کہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ تعدد ازدواج عیاشی ہی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ہمدردی

کی بھی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے اگر کوئی جوان عورت بے شادی شدہ رہ جائے یا بیوہ ہو جائے، اس کی معاشی ذمہ داری اٹھانے والا بھی کوئی نہ ہو اس کے ساتھ ایک شخص محض اس کی ہمدردی میں دوسری بیوی کی حیثیت سے شادی کرلے تو کیا اسے غلط کہا جا سکتا ہے یا اس پر عیاشی کا الزام عائد ہوتا ہے؟

بعض قیود اور شرائط

جو شخص تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سے شادی کرے، اسلام نے اس پر حسب ذیل پابندیاں عائد کی ہیں۔

۱۔ وہ مالی لحاظ سے اس حیثیت میں ہو کہ:۔

پہلی بیوی کے ساتھ اس کے بھی نان و نفقہ کی ذمہ داری اٹھائے اور اس کے لیے مکان فراہم کرے۔ بعض فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دوسری بیوی پہلی کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اسے الگ مکان مہیا کرے۔[1]

۲۔ وہ جسمانی لحاظ سے اس قابل ہو کہ زن و شو کے تعلقات رکھ سکے۔ اس کی قانونی حیثیت اور اس کے وقفہ کے بارے میں فقہاء نے بحث کی ہے۔ اس سے قطع نظر نکاح کا ایک مقصد عفت و عصمت کا تحفظ ہے، اس لیے بہت سے فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ وقفہ چار ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی تائید حضرت عمرؓ کے دور کے ایک فیصلہ سے بھی ہوتی ہے۔[2]

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو معروف کے مطابق بیوی سے ہم بستری کرنی چاہیے۔ یہ اس کے کھانے پینے کے نظم سے زیادہ اہم ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک چار ماہ میں کم از کم ایک مرتبہ ہم بستری واجب ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا انحصار عورت کی ضرورت اور مرد کی طاقت پر ہے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔[3]

---

[1] ردالمختار علی الدرالمختار ۲/۹۱۲، ۹۱۳ [2] ملاحظہ ہو المغنی لابن قدامہ ۷/۳۰—۳۱ ردالمختار علی الدرالمختار ۲/۵۲۶ – ۵۲۷ [3] فتاوی ابن تیمیہ ۳۲/۲۷۱ مطبوعہ ۱۳۹۸ھ

علامہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں:۔

اذا قدر الرجل من مالہ	اگر آدمی مالی اور جسمانی لحاظ سے چار شادیوں
ومن بنیتہ علی نکاح اربع	کی طاقت رکھے تو چار کرے۔ اگر اس کی مالی
فلیفعل واذا لم یحتمل	حالت یا جنسی تعلق کے لیے اس کی جسمانی
مالہ ولابنیتہ فی الباءۃ	حالت اس کی متحمل نہ ہو تو اسے صرف اتنی
فلیقتصر علی مایقدر علیہ[1]	ہی شادیاں کرنی چاہئیں جتنی کی وہ طاقت رکھتا ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص مالی اور جسمانی لحاظ سے اس قابل نہ ہو کہ وہ تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھا سکے اسے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہیے۔

۳۔ اگر آدمی مالی اور جسمانی لحاظ سے دوسری شادی کے قابل ہو تو بھی ضروری ہے کہ وہ دونوں کے درمیان ان تمام امور میں عدل و مساوات برتے جن میں مساوات برتنا عملاً ممکن ہے۔ اس میں نان ونفقہ، لباس، مکان اور شب گزاری آتے ہیں۔ عدل و انصاف اسلام کے نظام معاملات کی جان ہے۔ اس نے اس معاملہ میں عدل کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اگر یہ اندیشہ بھی محسوس ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کی موجودگی میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا تو ایک ہی پر قناعت کی ہدایت کی ہے۔ فرمایا: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً (النساء:۳)

(اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو)

علامہ ابوبکر جصاص حنفی کہتے ہیں کہ اگر کسی کو یہ خوف ہو کہ وہ چار بیویوں کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکتا تو اسے تین ہی کرنا چاہیے، اگر اندیشہ ہو کہ وہ تین میں بھی عدل نہیں کر سکے گا تو اسے دو ہی کرنا چاہیے اور دو کے درمیان بھی عدل کا یقین نہ ہو تو صرف ایک پر اکتفا کرنا چاہیے[2]۔

بیویوں کے درمیان عدم انصاف پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا کانت عند الرجل	جس شخص کے دو بیویاں ہوں اور وہ ان

---

[1] احکام القرآن ابن عربی ۱/۱۳۰ [2] احکام القرآن۔ جصاص ۲/۶۴

امرأتان فلم يعدل بينهما جاء يوم القيامة وشقه ساقط[1]

کے درمیان انصاف نہ کرے (اور ایک کی طرف جھک جائے) تو وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ جھکا ہوا ہوگا۔

بیویوں کے درمیان ان امور میں عدل و انصاف کرنا ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ سب سے یکساں محبت بھی کرے۔ کسی کی طرف دل کا جھکاؤ زیادہ اور کسی کی طرف کم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہم بستری اور مجامعت میں بھی مساوات ممکن نہیں ہے۔ اس کا تعلق طبیعت کے نشاط اور آمادگی پر ہے یہ آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقسم بین نسائہ فیعدل ویقول اللھم ھذا قسمی فی ما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز تقسیم کی جا سکتی تھیں وہ اپنی بیویوں کے درمیان تقسیم فرماتے اور انصاف کے ساتھ تقسیم فرماتے۔ پھر فرماتے اے اللہ جن چیزوں پر مجھے اختیار ہے ان میں یہ تقسیم میں نے کی ہے جن چیزوں کا تو مالک ہے اور جو میرے اختیار میں نہیں ہیں (محبت وغیرہ) اس میں کمی بیشی ہو تو اس پر میری گرفت نہ فرما۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی محبت اور قلبی تعلق کے نام پر کسی کی طرف اس طرح جھک جائے کہ دوسری کے ساتھ ظلم و زیادتی ہونے لگے اور وہ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بے شوہر کے زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔ قرآن صراحت کے ساتھ اس سے منع کرتا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْآ اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا

تم بیویوں کے درمیان، اگر چاہو بھی، پورا پورا عدل نہیں کر سکتے پھر بھی کسی ایک کی طرف بالکل جھک نہ جاؤ اور دوسری کو بیچ میں لٹکتا چھوڑ دو۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح کتاب النکاح، باب القسم بحوالہ ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی۔

[2] ایضاً۔

كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ (النساء: ۱۲۹)

۴۔ جس طرح دوسری بیوی کو وہ تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں جو پہلی بیوی کو حاصل ہیں اسی طرح اس سے ہونے والے بچوں کو بھی پہلی بیوی کے بچوں کے مساوی حقوق ملیں گے۔ دونوں بیویوں کی اولاد کے درمیان از روئے قانون کوئی فرق نہیں ہوگا۔ ان سب کی ذمہ داری ایک بہت بڑا بوجھ ہے جو تعددازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کے بعد آدمی پر عائد ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا آسان نہیں ہے لیکن بعض شخصی اور سماجی حالات میں تعددازواج کی اجازت اس پر پابندی لگانے سے زیادہ مفید ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔

طلاق کا مسئلہ

اسلام کے قانونِ طلاق پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس نے طلاق کا حق مرد کو دے کر عورت کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس کے لیے کسی معقول وجہ کا پایا جانا بھی ضروری نہیں ہے۔ یہ سراسر ایک طرفہ کارروائی ہے اور مرد کی مرضی پر اس کا انحصار ہے۔ وہ جب چاہے معمولی سی غلطی پر، بلکہ بغیر کسی غلطی کے بھی طلاق کے ذریعہ اسے الگ کر سکتا ہے۔ اس طرح اچانک ایک عورت کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے اور وہ بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

طلاق کی ضرورت پیش آسکتی ہے

جس بھیانک شکل میں طلاق کا ذکر کیا جاتا ہے ایک تو یہ کہ مسلم معاشرہ میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ طلاق بہت سے خانگی جھگڑوں اور پیچیدگیوں کا مناسب اور معقول حل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات عورت اور مرد کے لیے مل جل کر ازدواجی زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے دامن چھڑانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی دونوں کے مزاج میں مناسبت نہیں ہوتی۔ ان کے دل ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے، کبھی ان کے درمیان اتنا زیادہ معاشی اور معاشرتی فرق ہوتا ہے کہ اس کا دور کرنا دشوار ہوتا ہے، کبھی دونوں کی ذہنی اور علمی سطح ایک نہیں ہوتی جس کی وجہ سے قربت کے باوجود دوری کا احساس ہوتا ہے، کبھی ایسی اخلاقی کمزوریاں سامنے آتی ہیں کہ آدمی ان کی اصلاح سے بھی مایوس ہوتا ہے اور انھیں برداشت بھی نہیں کر پاتا۔ اس طرح کی صورتوں میں عقل اور سمجھ کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں میں علیحدگی ہو جائے۔ اگر عیسائیت کی طرح طلاق کی اجازت نہ ہو اور دونوں کو ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے تو اس سے وہ مقاصد ہرگز پورے

نہیں ہوتے جن کے لیے ان کے درمیان نکاح ہوا تھا۔ اس کے کئی نقصانات ہیں۔

ایک تو یہ کہ عورت، مرد کے لیے ایک بوجھ بن جائے گی اور وہ اس کے ساتھ بد سے بدتر سلوک کرے گا۔

دوسرے یہ کہ طلاق کے بعد عورت کا کسی ہم مزاج سے رشتہ ہو سکتا ہے اور وہ بہتر زندگی گزار سکتی ہے۔ طلاق کا راستہ بند کر دینے کے بعد یہ امکان ختم ہو جائے گا۔

تیسرے یہ کہ اس سے گھر کی زندگی جہنم زار بن جائے گی اور دونوں کا ذہنی سکون ختم ہو جائے گا۔

چوتھے یہ کہ دونوں کی آپس کی کشمکش کی وجہ سے اولاد پر وہ توجہ نہیں دی جا سکے گی جو فی الواقع دی جانی چاہیے۔ اس سے ان کی صحیح تربیت نہ ہوگی اور وہ جھگڑالو ماں باپ کے جھگڑالو بچے بن کر ابھریں گے۔

طلاق کا حق کسے حاصل ہو؟

اب اس سوال کو لیجئے کہ طلاق کا حق کسے حاصل ہو؟ اس کے تین جواب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ یہ حق دونوں کو حاصل ہو، دوسرا یہ کہ یہ حق مرد کو ملنا چاہیے، تیسرا یہ کہ اسے عورت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

پہلی صورت پر عمل کرنے سے صاف بات ہے طلاق کی کثرت ہوگی اور خاندان کے ادارے کو سخت نقصان پہونچے گا۔ اس لیے کہ اگر طلاق کا اختیار عورت اور مرد میں سے کسی ایک کو ہو تو اس کا استعمال نسبتاً کم ہوگا اور اگر یہ حق دونوں کو مل جائے اور دونوں اسے اپنی آزاد مرضی سے استعمال کریں تو فطری طور پر اس میں زیادتی ہوگی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس سوسائٹی میں طلاق کا تناسب کم ہوتا ہے اس کا خاندانی نظم مضبوط ہوتا ہے اور جہاں اس میں اضافہ ہوتا ہے خاندان درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ مغرب نے یہ اختیار دونوں ہی کو دے رکھا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نکاح ایک مذاق بن گیا ہے، عورت اور مرد میں سے جو چاہے اور جب چاہے اس رشتہ کو توڑ کر اپنی راہ لیتا ہے۔ طلاق کی کثرت سے خاندان اپنی تباہی کا مرثیہ پڑھ رہا ہے۔

دوسری صورت اسلام نے اختیار کی ہے۔ اس نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کو خاندان میں برتر حیثیت حاصل ہے۔ وہ قوام اور نگراں ہے۔ وہ بیوی کی مالی ذمہ داریاں برداشت کرتا ہے، اس کے ساتھ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بوجھ اٹھاتا ہے، اس لیے وہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ بیوی کے ساتھ مل کر وہ ان ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن کے الفاظ میں اسی کے ہاتھ میں عقدۂ نکاح (رشتۂ نکاح کا باندھنا اور ختم کرنا) ہوتا ہے۔ (البقرہ: ۲۳۷) یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہے کہ جس بیوی کو وہ ناپسند کرے یا جس کا تعاون اسے حاصل نہ ہو اس بیوی کو اپنے گھر کی ملکہ بنائے رکھنے پر اسے مجبور کیا جائے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرد کو طلاق کا حق مل جائے تو اسے وہ من مانے طریقہ سے استعمال کرنے لگے گا، اس لیے کہ اس میں اس کا زبردست مالی نقصان ہے۔ بیوی کو اس نے جو مہر دیا ہے، اس کا وہ مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اگر نہیں دیا ہے تو طلاق کے وقت اسے دینا پڑے گا [illegible]ی کے زیورات وغیرہ سے بھی وہ محروم ہو جائے گا۔ بیوی اسے لے جائے گی۔ اس مدت میں اس نے بیوی پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ بھی اسے واپس نہیں ملے گا۔ اس کے بعد اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو از سر نو اسے مہر دینا ہوگا، شادی کے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے اور اس کی معاشی ذمہ داریاں اٹھانی ہوں گی۔ اس کے ساتھ اگر پہلی بیوی کے بچے ہوں تو ان کی کفالت بھی اسے کرنی ہوگی۔ وہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے ہیں جو مرد کے حق طلاق پر اعتراض کرتے ہیں، ان بے چاروں کو زندگی کے ان حقیقی مسائل پر سوچنے کی شاید فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن جس شخص کے سامنے یہ سارے مسائل ہوں وہ ایک بیوی کو طلاق دے کر دوسری کے ذریعہ گھر آباد کرنے سے پہلے ان پر غور و سوچے گا اور بار بار سوچے گا۔ تخریب کے بعد تعمیر کھیل نہیں ہے۔

اب تیسری صورت کو لیجیے۔ وہ یہ کہ حق طلاق عورت کو دیا جائے۔ اس سے طلاق کا غلط اور بے جا استعمال ختم نہ ہوگا۔ مرد حقِ طلاق کے ناروا استعمال سے عورت کو پریشان کر سکتا ہے تو اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس حق کے ملنے پر عورت اس کا نامناسب استعمال کر کے مرد کو مصیبت میں ڈال دے۔

عورت کو یہ حق دینے میں بعض قباحتیں بھی ہیں۔

ا۔ مرد کے ساتھ یہ بہت بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے کہ عورت کی ساری ذمہ داریاں مرد اٹھائے اور حق طلاق عورت کے ہاتھ میں رہے۔

۲۔ طلاق سے مرد کا نقصان ہے۔ عورت کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اگر طلاق کا اختیار اسے حاصل ہو تو کوئی بھی بداخلاق عورت جب چاہے مرد کو طلاق دے کر بچوں کو اس کے حوالہ کردے گی اور مہر اور زیورات لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوگی۔ پھر نئے مہر اور نئے ساز و سامان کے ساتھ دوسرے مرد سے شادی کرلے گی۔

۳۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت زیادہ جذباتی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی وقتی جوش اور جذبہ کے تحت مرد سے علٰحدگی اختیار کرسکتی ہے۔ اس سے طلاق کا تناسب بہت بڑھ جائے گا اور معاشرہ ایک نئے بحران سے دوچار ہوجائے گا۔

عدالت کے ذریعہ طلاق کی قباحت

اس کا حل یہ سمجھا جاتا ہے کہ عدالت کے ذریعہ طلاق ہو۔ میاں بیوی میں سے جو بھی الگ ہونا چاہے عدالت سے درخواست کرے۔ اگر عدالت ان اسباب سے مطمئن ہو جو علٰحدگی کے لیے بیان کیے گئے ہیں تو ان کے درمیان تفریق کردے ورنہ درخواست رد کردی جائے۔

اس میں قباحت یہ ہے کہ زوجین میں سے جو بھی طلاق حاصل کرنا چاہے گا وہ عدالت کو مطمئن کرنے کے لئے فریق ثانی کی حقیقی کمزوریاں اور زیادتیاں ہی نہیں بیان کرے گا بلکہ وقت ضرورت اس پر سخت سے سخت اور سنگین الزامات بھی عائد کرے گا۔ اس پر یقینی طور پر جوابی الزامات کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ اس سے دونوں کی سیرت اور اخلاق اس قدر مجروح ہوں گے کہ سوسائٹی میں ان کا وقار باقی نہیں رہے گا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنی ہی نہیں پورے خاندان کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا سامان کریں گے۔

پھر عدالت کا جو حال ہے اس سے ساری دنیا واقف ہے۔ وہاں سے کوئی فیصلہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس پوری مدت میں وہ کیسے ایک ساتھ زندگی گزاریں گے بلکہ ایک دوسرے کو برداشت کریں گے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر عدالت سے علٰحدگی نہ ہو تو میاں بیوی دونوں بہ جبر واکراہ ایک دوسرے سے بندھے رہیں گے۔ اس سے دونوں کی جان ضیق میں پڑی رہے گی۔ ان کے لیے خوش گوار زندگی کا تصور بھی مشکل ہوگا۔

بعض اخلاقی ہدایات

اسلام انسان کا جو ذہن اور مزاج بناتا ہے اور جس طرح اس کی تربیت کرتا ہے، اس میں طلاق کی نوبت کم ہی آسکتی ہے اور یہ خطرہ بس امکان ہی کے درجہ میں رہتا ہے کہ آدمی محض جنسی لذت اور حظِ نفس کے لیے طلاق کی تلوار چلاتا پھرے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو اخلاقی ہدایات دی ہیں ذیل میں ان کا ایک ہلکا سا تصور دیا جا رہا ہے۔

نکاح ایک سنجیدہ معاہدہ ہے

اسلام کے نزدیک نکاح کے ذریعہ عورت اور مرد چند دن کے عیش یا تفریح کے لیے نہیں ملتے بلکہ وہ زندگی بھر کی رفاقت کا عہد باندھتے ہیں۔ اس عہد کو قرآن نے 'میثاقِ غلیظ' سے تعبیر کیا ہے (النساء:۲۱) جو شخص سنجیدگی سے یہ عہد کرے وہ آسانی سے توڑنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ یہ مذاق وہی کرسکتا ہے جو اس کی اہمیت کو نہ محسوس کرتا ہو اور بے شعوری کے عالم میں اتنا بڑا عہد کر بیٹھا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح اور طلاق کے معاملہ میں مذاق کو ناروا قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ اس سنجیدگی کے منافی ہے جو اس سلسلہ میں ہونی چاہیے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔

ثلاث جِدّ هن جدّ	تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں سنجیدگی تو
وهزلهنّ جِدٌّ النكاح	سنجیدگی ہے ہی۔ مذاق بھی سنجیدگی ہی
والطلاقُ والرجعةُ [1]	سمجھا جائے گا۔ وہ ہیں نکاح، طلاق اور
	اس سے رجوع۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی "طلاق علی الہزل" ترمذی، ابواب الطلاق واللعان، باب ماجاء فی الجد والہزل فی الطلاق۔

امام خطابی کہتے ہیں۔ اس پر علماء کا عام اتفاق ہے کہ اگر کوئی عاقل و بالغ صراحت کے ساتھ طلاق دے تو طلاق ہو جائے گی۔ اسے وہ مذاق قرار دے کر کالعدم کرنا چاہے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ بعض علماء نے اس حرکت کو اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ مذاق کے ہم معنی کہا ہے۔ اس لیے کہ اسے جائز کر دیا جائے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ ایک شخص نکاح کرنے، طلاق دینے اسی طرح غلام کو آزاد کرنے کے بعد یہ کہہ کر اپنے اقدام کو واپس لے سکتا ہے کہ وہ مذاق کر رہا تھا اس سے احکام الٰہی پر عمل ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے حدیث میں جن باتوں کا ذکر ہے ان کے بارے میں زبان سے کسی فیصلہ کے اظہار کے بعد ان پر عمل لازم آجائے گا۔[1]

طلاق سخت ناپسندیدہ ہے

اسلام نے وقت ضرورت طلاق کی اجازت ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کوئی مستحسن فعل نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک سخت ناپسندیدہ اقدام ہے، اس لیے ناگزیر ضرورت اور انتہائی مجبوری ہی میں یہ اقدام ہونا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق[2] — اللہ عزوجل کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

حضرت محارب بن دثارؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

ما احل اللہ شیئا ابغض الیہ من الطلاق[3] — اللہ نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو طلاق سے زیادہ اسے ناپسند ہو۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت معاذؓ سے مروی ہے۔ گو یہ سنداً کمزور ہے لیکن اوپر کی روایات کی تائید کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یامعاذ ماخلق اللہ شیئا علی وجہ الارض احب — اے معاذ! اللہ نے سطح زمین پر کوئی ایسی چیز نہیں پیدا کی جو غلام کو آزاد کرنے سے

---

[1] معالم السنن: ج ۳، ۲۲۳ [2] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق۔ ابن ماجہ، ابواب الطلاق [3] ابوداؤد، حوالہ سابق

الیہ من العتاق ولا خلق	زیادہ اسے پسند ہو۔ اسی طرح اس نے
اللہ شیئا علی وجہ الارض	روئے زمین پر کوئی ایسی چیز نہیں پیدا کی
ابغض الیہ من الطلاق[1]	جو طلاق سے زیادہ اسے مبغوض ہو۔

ایک طرف اسلام نے مرد کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ طلاق ایک ناپسندیدہ عمل ہے دوسری طرف عورت کو ہدایت کی کہ وہ بلاوجہ مرد سے طلاق کا مطالبہ نہ کرے۔ حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ایما امرأۃ سالت زوجہا	جو عورت بغیر کسی مجبوری کے شوہر سے طلاق
طلاقا فی غیر ما باس فحرام	کا مطالبہ کرے تو اس پر جنت کی خوشبو
علیہا رائحۃ الجنۃ[2]	بھی حرام ہے۔

عورت کی کمزوریوں کو برداشت کیا جائے

اجتماعی زندگی کسی فردِ واحد کی مرضی کے تابع نہیں ہوتی۔ آدمی کو اجتماعی مفاد کے لیے اپنی رائے اور مرضی کو قربان کرنا پڑتا ہے ازدواجی زندگی میں بھی اس طرح کے مواقع آتے رہتے ہیں جب کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کی رائے اور رجحان سے اختلاف ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو کوئی بات پسند نہ آئے تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ جھٹ سے طلاق دے کر اس پاکیزہ رشتہ ہی کو ختم کر دیا جائے۔ بعض اوقات آدمی پر جذبات اور خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے وہ اپنا صرف فوری فائدہ دیکھتا ہے، بڑے اور اہم مفادات اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خاندان کے وسیع تر مصالح اور اہم مفادات کے پیشِ نظر معمولی غلطیوں کو برداشت کرنا چاہیے اور محبت اور حسنِ سلوک کا رویہ جاری رکھنا چاہیے۔ فرمایا:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ	اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی
فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ	بسر کرو۔ اگر تم ان کو ناپسند کرو تو ہو سکتا

---

[1] دارقطنی مع التعلیق المغنی کتاب الطلاق مطبوعہ دہلی صفحہ ۴۳۹ [2] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب الخلع والطلاق بحوالہ ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی

تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء: ۱۹)

ہے کہ ایک چیز تم کو ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھ دی ہو۔

اصلاح کی کوشش کی جائے

عورت نافرمان ہے، سرکشی پر آمادہ ہے، اطاعت نہیں کر رہی ہے تو بھی اسلام فوراً طلاق کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کے لیے اس نے مرد کو خصوصی اختیارات دیئے ہیں تاکہ وہ نرمی اور سختی سے اصلاح کی بھرپور کوشش کرے، گھر کے اختلافات گھر ہی کے اندر رہیں اور طلاق کی نوبت نہ آئے۔ فرمایا:۔

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (النساء: ۳۴)

جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تم انھیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو اور اس پر بھی اصلاح نہ ہو تو مارو۔ اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان پر زیادتی کے لیے بہانے نہ تلاش کرو۔ بےشک اللہ سب سے اونچا اور بڑا ہے۔

جو عورت سرکشی اور نافرمانی پر آمادہ ہو اس کی اصلاح کا طریقہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے وعظ و نصیحت کی جائے اور سمجھایا بجھایا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے اندر خدا اور آخرت کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جائے اور خاندان کے مصالح کا احساس ابھارا جائے۔ یہ سب کچھ نرمی اور محبت ہی سے ممکن ہے۔ اس میں کامیابی نہ ہو تو قرآن کہتا ہے وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو) صحابہ و تابعین نے اس کی تین تشریحیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے ساتھ ہی انھیں بستر پر لٹاؤ لیکن ان سے جنسی تعلق نہ رکھو۔ دوسرے یہ کہ ان کو ساتھ لٹاؤ لیکن اپنی ناگواری کے اظہار کے لیے ان سے رخ پھیر لو اور بات نہ کرو۔ تیسرے یہ کہ ان کا بستر اپنے بستر سے الگ کر لو۔[1]

---

[1] ابن جریر: جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۵ ص ۳۱-۴۰

یہ ایک نفسیاتی تدبیر ہے۔ اس پر مرد اسی وقت عمل کر سکتا ہے جب کہ خود اس کے اندر غیر معمولی ضبطِ نفس ہو۔ اگر وہ اس ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرے تو اس کا امکان ہے کہ عورت سرکشی سے باز آجائے۔ جنسی جذبہ بڑا شدید جذبہ ہے۔ جو شخص اس معاملہ میں اپنی قوتِ ارادی کا ثبوت فراہم کرے عورت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

بعض طبیعتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کے لیے یہ علاج کارگر نہ ہو، اس صورت میں قرآن نے عورت کو مارنے کی بھی اجازت دی ہے۔ یہ بات بڑی بھیانک معلوم ہوتی ہے لیکن ایک تو یہ کہ اس اجازت پر عمل اس وقت ہو گا جب کہ پہلے دو طریقوں سے عورت اصلاح قبول نہ کرے اور اپنی سرکشی پر قائم رہے۔ اسے پہلے ہی قدم پر نہیں بلکہ آخری چارۂ کار کے طور پر اختیار کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے وَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ [1] یعنی اصلاح کے لیے انھیں مارنے کی اجازت تو ہے لیکن یہ مار سخت نہیں ہونی چاہیے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں مسواک یا اس جیسی کسی چیز سے مارا جائے۔ حضرت قتادہؒ کہتے ہیں ایسی مار جس سے جسم میں عیب نہ پیدا ہو۔ حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے ایسی مار جس سے جسم میں نشان نہ پڑے [2]

اس سے ہٹ کر وحشیانہ طریقہ سے اگر کوئی شخص عورت کی مار پیٹ شروع کر دے تو اسلامی قانون اس کے خلاف حرکت میں آجائے گا۔ امام نووی فرماتے ہیں شریعت نے جس حد کے اندر عورت کو مارنے کی اجازت دی ہے اس سے بھی اگر عورت انتقال کر جائے تو (اسے قتلِ خطا سمجھا جائے گا) شوہر کے عاقلہ (خاندان والوں) پر دیت واجب ہو جائے گی۔ اور قتلِ خطا کا کفارہ تنہا شوہر کو ادا کرنا ہو گا [3]

طلاق سے روکنے کے لیے عورت اپنے حقوق چھوڑ سکتی ہے

ایک طرف اسلام نے مرد کو اس بات کی بار بار تاکید کی ہے کہ وہ عورت کے ساتھ [illegible]

---

[1] مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی ﷺ [2] ابن کثیر: [illegible] ج ۱ ص ۴۰۲

[3] نووی: شرح مسلم [illegible] ۳۹۰

سے بہتر سلوک کرے' اس کے حقوق پہچانے' اس کی غلطیوں کو نظر انداز کرے۔ اس کی خوبیوں کو دیکھے اور اس کی کمزوریوں اور خامیوں کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرے۔ دوسری طرف عورت سے کہا کہ معمولی معمولی بات پر طلاق کا مطالبہ لے کر نہ بیٹھ جائے' اگر وہ دیکھے کہ شوہر اس سے بے رخی برت رہا ہے تو اپنے حقوق کے مطالبہ اور اس پر اصرار کی جگہ حقوق کے چھوڑنے کے لیے بھی تیار رہے۔ شوہر سے صف آرائی کی جگہ صلح صفائی کی امکانی کوشش کرے۔ عورت کی طرف سے کسی پیش کش کو قبول کرنے میں مرد کا بے جا پندار حائل ہو سکتا تھا اس لیے اگر عورت اپنے کچھ حقوق سے دست بردار ہو کر مرد کی ذمہ داریوں کو کم کر دے تو اس میں مرد کو سبکی یا توہین نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ عورت اس کی مدد کرے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائے تو یہ اس کے شان کے منافی نہیں ہے۔ فرمایا:۔

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا	اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی
نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ	اور بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج
عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا	نہیں کہ دونوں آپس میں کسی طرح صلح کر لیں۔
صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ	صلح بہر حال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف
الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا	جلد مائل ہو جاتے ہیں اگر تم لوگ احسان
وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا	سے پیش آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ
تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (النساء: ۱۲۸)	جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اگر عورت اس بات کا خطرہ محسوس کرے کہ مرد کے اندر اس سے نفرت اور دوری پیدا ہو رہی ہے تو اسے نان و نفقہ' لباس اور شب باشی کے جو حقوق حاصل ہیں وہ پورے کے پورے بھی چھوڑ سکتی ہے اور ان میں کمی بھی کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مرد اسے مان کر صلح کرلے' وہ شوہر پر خرچ کر سکتی ہے وہ اسے قبول کر سکتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے' والصلح خیر' یعنی دونوں کے درمیان تفریق ہونے سے صلح ہو جانا بہتر ہے۔[1]

دونوں طرف کے ذمہ دار اصلاح کی کوشش کریں

بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلافات شروع ہوتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ان میں شدت آجاتی ہے پھر میاں بیوی کے درمیان ایک طرح کی دوری اور حجاب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتے کہ جھگڑوں کو فراموش کر کے خود سے صلح صفائی کر لیں۔ قرآن نے ہدایت کی کہ جہاں دونوں آپس میں اختلافات حل نہ کر سکیں وہاں دونوں طرف کے ایک ایک ذمہ دار سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان اختلافات کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر خلوص ہو تو اللہ کی مدد حاصل ہوگی اور جو مسائل ناقابل حل سمجھے جاتے ہیں ان کے بھی حل کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا	اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے
فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ	کا ڈر ہو تو ایک حکم مرد والوں کی طرف سے
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ	اور ایک عورت والوں کی طرف سے مقرر
اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا	کرو۔ وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں تو اللہ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا	ان کے درمیان موافقت کرا دے گا۔ بیشک
(النساء: ۳۵)	اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

طلاق کے سلسلہ میں دو اصلاحی اقدامات

ان ساری کوششوں میں ناکامی کے بعد طلاق کا موقع آتا ہے۔ اس میں اسلام نے حسب ذیل اصلاحی اقدامات کیے۔

۱۔ عرب میں طلاق اور اس سے رجوع کی کوئی حد نہیں تھی۔ جو شخص اپنی بیوی کو تنگ کرنا چاہتا وہ اسے طلاق دیتا پھر مدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا۔ پھر طلاق دیتا پھر رجوع کر لیتا جب تک وہ چاہتا یہ سلسلہ جاری رہتا[1] اس طرح عورت شوہر والی ہونے کے باوجود

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ۱/۲۷۱ - ۲۷۲

مطلقہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی۔ قرآن نے کہا طلاق صرف دو بار دی جا سکتی ہے اسی میں آدمی کو رجوع کا حق ہوگا۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ	طلاق (رجعی) دو بار ہے۔ پھر یا تو عورت کو
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ	معروف طریقہ سے رکھ لیا جائے یا بھلے
بِاِحْسَانٍ (البقرہ: ۲۲۹)	طریقے سے رخصت کر دیا جائے۔

تیسری بار طلاق دی تو رجوع کا حق ختم ہو جائے گا اور بیوی جدا ہو جائے گی۔

۲۔ آدمی تین طلاقوں کے اس حق کو بھی لمبے لمبے وقفہ کے لیے استعمال کرکے عورت کو پریشان کر سکتا تھا۔ جیسے ایک طلاق دے اور سال دو سال تک رجوع نہ کرے پھر جی چاہے تو رجوع کر لے۔ اسی طرح دوبارہ طلاق دے کر ایک طویل عرصہ تک اسے لٹکائے رکھے۔ نہ اس کے حقوق ادا کرے اور نہ اسے جدا کرے جب اس سے بھی اکتا جائے تو تیسری طلاق دے کر الگ کر دے۔

اسلام نے اس زیادتی سے روکنے کے لیے ایک مختصر سی مدت مقرر کر دی۔ اسی مدت کے اندر مرد کو طلاق سے رجوع یا عدم رجوع کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اسی کو اصطلاح میں 'عدت' کہا جاتا ہے۔ عدت گزرنے کے بعد بیوی خود بخود آزاد ہو جائے گی اور اپنی مرضی سے جہاں چاہے دوسری شادی کر سکے گی[1]

قرآن مجید نے ہدایت کی کہ طلاق دی جائے تو اس کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے کہ آدمی جب چاہے طلاق دے بیٹھے اور اسے یہ بھی نہ معلوم ہو کہ کب طلاق دی اور کب اس کی عدت ختم ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ	اے نبی جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو
فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا	تو ان کو عدت پر طلاق دو اور عدت کا
الْعِدَّةَ (الطلاق: ۱)	حساب رکھو۔

---

[1] اگر مرد تین طلاق ایک ساتھ دے دے تو رجوع کا حق ہی ختم ہو جائے گا اور عدت پوری ہونے کے بعد عورت کو دوسری شادی کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا۔

طلاق کی نوبت خلوت صحیحہ کے بعد بھی آسکتی ہے اور خلوت صحیحہ سے پہلے بھی۔
خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دی جائے تو اس کی عدت تین حیض ہے۔ ارشاد ہے:۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ	جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے تین
ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ: ۲۲۸)	حیض تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔

یہ جوان عورت کا ذکر ہے جسے حیض آتا ہو۔ جن عورتوں کو کم سنی، کبر سنی یا اور کسی وجہ سے حیض نہ آئے ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اگر عورت حاملہ ہے تو وضع حمل اس کی عدت ہوگی۔

وَالّٰٓئِ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ	اور تمہاری جو عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی
نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ	ہوں اگر تمہیں ان کے بارے میں شبہ ہو تو
ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِ لَمْ	(تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ) ان کی عدت
يَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ	تین ماہ ہے یہی حکم ان عورتوں کا ہے جنھیں
اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ	ابھی تک حیض نہیں آیا ہے۔ اور جن عورتوں
	کے حمل ہو ان کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع
(الطلاق: ۴)	حمل ہو جائے۔

اگر خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق ہوئی ہے تو اس کی کوئی عدت نہیں ہے۔ ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ	اے ایمان والو! جب تم ایمان والی عورتوں
الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ	سے نکاح کرو اور ہاتھ لگانے سے پہلے انھیں
مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ	طلاق دے دو تو تمہیں انھیں عدت میں
عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا	بٹھانے کا حق نہیں ہے کہ اس کی گنتی پوری
فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ	کراؤ۔ انھیں متاع دو اور اچھی طرح رخصت
سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب: ۴۹)	کردو۔

طلاق کس طرح دی جائے؟

اسلام نے طلاق کی اجازت تو ضرور دی ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ آدمی بے سوچے

سمجھے محض جذبات کی رو میں طلاق نہ دے بیٹھے۔ بلکہ طلاق کا فیصلہ ہو تو انتہائی سنجیدگی سے اور غور و فکر کے بعد ہو۔ طلاق اس وقت دی جائے جب کہ عملاً میاں بیوی میں نباہ مشکل ہو جائے اور علیٰحدگی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہ جائے۔ اس معاملہ میں بے احتیاطی سے بچنے کے لیے اس مسنون طریقہ کو اپنانا ہوگا جو احادیث میں بیان ہوا ہے۔ اس سے دو ہدایات ہمیں ملتی ہیں۔

۱۔ حالت حیض میں طلاق نہ دی جائے

حدیث میں حالت حیض میں طلاق دینے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے۔ حیض کے دوران عورت کے اندر وہ نشاط اور تازگی نہیں رہتی جو عام حالت میں ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایک طرح کا چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے اس میں اس کا امکان ہے کہ عورت کی کوئی بات مرد کو ناگوار گزرے اور وہ طلاق دے بیٹھے اس مدت میں بیوی سے تعلق نہیں رکھا جا سکتا اس لیے عورت کی کمزوریوں کو برداشت کرنے کی جگہ کوئی سخت قدم اٹھانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ صحاح کی سب ہی کتابوں میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حیض کی حالت میں بیوی کو طلاق دے دی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجوع کا حکم دیا اور فرمایا جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو حالتِ طہر میں ہم بستری کیے بغیر طلاق دیں تاکہ یہ یقین ہو کہ حمل نہیں ہے۔[1]

۲۔ حالتِ طہر میں طلاق دی جائے

دوسری بات حدیث میں یہ کہی گئی ہے کہ آدمی طلاق دے تو حالتِ طہر میں ہم بستری کے بغیر صرف ایک طلاق دے۔ دوبارہ عورت جب حیض سے فارغ ہو جائے تو ہم بستری کے بغیر ہی دوسری مرتبہ طلاق دے۔ پھر سہ بارہ اسی طرح حیض کے ختم ہونے کے بعد طلاق دی جائے[2] حدیث میں طلاق کا جو طریقہ بیان ہوا ہے اس میں بہت سی حکمتیں پائی جاتی ہیں۔

---

[1] بخاری، کتاب الطلاق۔ مسلم، کتاب الطلاق۔ ابوداؤد۔ اول کتاب الطلاق۔ ودیگر کتب حدیث۔
[2] حوالۂ سابق۔

ایک حکمت تو یہ ہے کہ طہر اس بات کی علامت ہے کہ عورت حاملہ نہیں ہے۔ ہم بستری سے حمل کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ شریعت چاہتی ہے کہ عورت کا حاملہ یا غیر حاملہ ہونا واضح رہے اس لیے کہ اس سے بہت سے دوسرے مسائل وابستہ ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مرد طلاق دینا چاہے تو طہر میں ہم بستری سے اجتناب کرے۔ ایک بڑی حکمت اس طریقہ میں یہ پوشیدہ ہے کہ حالت طہر میں میاں بیوی کا رجحان جنسی تسکین کی طرف ہوتا ہے، اس وجہ سے وہ بہت سے اختلافات کو بھول جاتے ہیں یا برداشت کرنے لگتے ہیں۔ جس طہر میں ایک مرتبہ بھی جنسی تسکین کا موقع مل جائے اس رجحان میں کچھ نہ کچھ کمی آسکتی ہے، اس لیے ہدایت کی گئی کہ حالت طہر میں جنسی تعلق سے کنارہ کش رہ کر طلاق دی جائے۔ یہ نفسیاتی طور پر ایک مشکل کام ہے۔ یہ مشکل اور بڑھ جاتی ہے جب کہ تینوں طلاقیں اسی طرح حالت طہر میں جنسی تعلق قائم کئے بغیر دی جائیں۔ اس پر آدمی اسی وقت عمل کر سکتا ہے جب کہ اس نے طلاق کا پوری سنجیدگی سے فیصلہ کر لیا ہو۔

فقہ حنفی میں ہے کہ جس عورت کو حیض نہ آرہا ہو یا جو حاملہ ہو اسے ایک ایک ماہ کے وقفہ سے ایک ایک طلاق دینا سنت ہے۔ انھیں ہم بستری کے فوراً بعد بھی طلاق دی جاسکتی ہے لیکن فقہ حنفی ہی میں امام زفر کی رائے یہ ہے کہ ہم بستری کے بعد جب ایک ماہ گزر جائے تب ہی انھیں طلاق دی جائے گی۔

جس عورت سے خلوت نہیں ہوئی ہے، سنت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اسے بھی حالت طہر ہی میں طلاق دی جائے۔ اسے حالت حیض میں بھی طلاق دی جاسکتی ہے۔ امام زفر کا اس میں بھی اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک اسے بھی حالت طہر ہی میں طلاق دی جانی چاہئے۔[1]

۲۔ عدت کے دوران عورت شوہر کے گھر رہے گی

طلاق کے بعد جب تک عدت پوری نہ ہو جائے قرآن نے حکم دیا ہے کہ عورت شوہر کے

---

[1] ہدایہ ۲: ۳۲۶-۳۲۰

گھر رہے گی اِلّا یہ کہ اس سے کوئی بے حیائی کا فعل سرزد ہو اور ساتھ رہنا مشکل ہو جائے۔ فرمایا۔

لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ	زمانہ عدت میں ان عورتوں کو ان کے گھروں
وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ	سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں اِلّا یہ کہ وہ
بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ (الطلاق : ۱)	کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کریں۔

اس کی ایک مصلحت یہ ہے کہ ایک گھر میں ساتھ رہنے کی وجہ سے مرد کو اپنے فیصلہ پر اور عورت کو اپنے رویہ پر غور و فکر کرنے اور سوچنے کا موقعہ ملے گا اس طرح تعلقات کی بحالی کی کوئی صورت نکل سکے گی۔

ان تینوں باتوں پر عمل ایک ساتھ ہو تو طلاق میں جلد بازی اور بے احتیاطی کے امکانات یقیناً کم سے کم تر ہو جائیں۔ اگر ایک سے دو بار طلاق کی نوبت آ بھی جائے تو آدمی کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے اور رجوع کرنے کا موقعہ باقی رہے گا۔

رجوع کا حق اور اس کا طریقہ

ایک یا دو طلاق دینے پر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کا حق ہے۔ اگر صریح الفاظ میں رجوع ہو تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رجوع ہو جائے گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں رجوع لازماً زبان سے ہونا چاہئے۔ احناف کے نزدیک ہم بستری، بوس و کنار وغیرہ بھی رجوع کے ہم معنی ہے۔ امام شافعی نے رجوع پر گواہوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن احناف اسے صرف مستحب اور پسندیدہ کہتے ہیں۔ امام مالک کی بھی یہی رائے ہے[1]

کسی نے ایک یا دو طلاق دی اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع نہیں کیا تو بیوی جدا ہو جائے گی۔ وہ اگر دوبارہ اس سے ازدواجی تعلق قائم کرنا چاہے اور بیوی بھی اس کے لیے آمادہ ہو تو نئے مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ بیوی انکار کر دے تو وہ زبردستی نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی شخص تیسری مرتبہ طلاق دے دے تو بیوی سے اس کا تعلق ختم ہو جائے گا۔ اب

---

[1] ہدایہ ۲: ۳۷۵ - بدایۃ المجتہد ۲: ۵۲

اس سے نکاح کی صورت صرف یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص سے اس عورت کے نکاح کے بعد پھر طلاق ہو جائے یا وہ انتقال کر جائے اور دونوں دوبارہ نکاح کے لیے تیار ہو جائیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ: ۲۳۰)	اگر مرد عورت کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے۔ اگر دوسرا شوہر اسے طلاق دے دے اور پہلا شوہر اور وہ دونوں سمجھیں کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم رکھ سکیں گے تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کے قائم کردہ حدود ہیں انھیں وہ جاننے والوں کے لیے بیان کرتا ہے۔

اس طرح تین طلاق کے بعد رجوع بہت مشکل ہے' انسان کی طبیعت بھی شاید بخوشی اس کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ یہ صورت اس لیے رکھی گئی ہے کہ تین طلاق دینے سے پہلے آدمی اچھی طرح سوچ لے کہ اب رجوع آسان نہیں ہے۔ عورت ہمیشہ کے لیے جدا ہو سکتی ہے۔

طلاق میں بے احتیاطی اور اس کا علاج

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص تین طہر میں یا ایک ایک مہینہ کے وقفہ سے تین طلاق نہ دے بلکہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالے تو کیا اسے رجوع کا حق حاصل ہوگا یا یہ طلاقیں بائن سمجھی جائیں گی اور اسے رجوع کا حق حاصل نہ ہوگا۔

عام فقہاء کے نزدیک یہ طلاقیں بائن ہوں گی اور رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا' اہلِ حدیث حضرات اسے طلاق رجعی مانتے ہیں۔ یہ ایک قانونی بحث ہے۔ اتنی بات سب کے نزدیک طے ہے کہ یہ ایک غیر مسنون اور ناپسندیدہ طریقہ ہے۔ فقہ حنفی میں تو اسے طلاق بدعت کہا گیا ہے کہ آدمی

ایک ہی مجلس میں یا ایک ہی طہر میں تین طلاق دے۔ احناف کے نزدیک احسن طریقہ یہ ہے کہ آدمی طلاق کا فیصلہ کرے تو صرف ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، اگر عدت گزر جائے تو اس میں کم سے کم از سر نو نکاح کے ذریعہ دونوں مل سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام ایک طلاق سے زیادہ نہیں دیتے تھے۔

ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں بالعموم وقتی غم و غصہ یا کسی ناگواری کی وجہ سے دی جاتی ہیں اس کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا فیصلہ نہیں ہوتا اس غلط اور ہنگامی اقدام کے سنگین نتائج سامنے آتے ہیں اور آدمی اچانک اپنا گھر اجڑتا ہوا دیکھتا ہے تو افسوس کرنے لگتا ہے۔ سنت نے طلاق کا جو طریقہ بتایا ہے اس پر عمل ہو تو محض عجلت اور جلد بازی سے جو پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ پیدا نہیں ہوں گی۔ طلاق بعض اوقات ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اسلام نے اس کا بہترین طریقہ بتایا ہے۔ اسے عام کرنے اور اس کی تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے وہ تمام اعتراضات از خود رفع ہو جاتے ہیں جو اس موضوع پر کئے جاتے ہیں۔

مطلقہ کا نفقہ

اسلام کے قانونِ طلاق پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مرد طلاق کے دو بول بول کر عورت کو بیک بینی و دو گوش گھر سے نکال باہر کر دیتا ہے اور وہ سوسائٹی میں بے یار و مددگار در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ اعتراض بہت پرانا اور بڑا بے جان ہے۔ لیکن اسے بار بار اس طرح دہرایا جاتا ہے جیسے اسلامی شریعت کے لیے یہ ایک زبردست چیلنج ہے اور اس کا اس کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ اس اعتراض کا کھوکھلا پن ہر پہلو سے واضح کیا جاتا رہا ہے لیکن جن لوگوں کا مقصد محض اعتراض ہو وہ اپنی کمزوری کبھی تسلیم نہیں کر سکتے اور انھیں کوئی جواب مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے اعتراض کو معقول مان کر ان کے حسب منشا قانونِ شریعت کی 'خامیوں' کو دور کر دیا جائے اور اس کی مناسب 'اصلاح' کر دی جائے۔ ان کے نزدیک جو شخص عورت کو طلاق دے اسے یہ سزا ضرور ملنی چاہیے کہ وہ اس کی زندگی بھر اس کا نان و نفقہ برابر دیتا رہے۔ ہاں اگر اس کی دوسری شادی ہو جائے یا وہ خود کفیل ہو جائے تو مرد کو اس کی معاشی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا جائے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے نے اسلام کے نظامِ طلاق پر ہونے والے اس اعتراض کو ایک طرح سے صحیح قرار دے دیا ہے اور اس تجویز کو قانونی سند عطا کر دی ہے کہ طلاق کے بعد بھی عورت کا نفقہ اس کی زندگی بھر یا تا نکاحِ ثانی جاری رہنا چاہیے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس مسئلہ کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔[1]

---

[1] جس مقدمہ میں یہ فیصلہ ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ محمد احمد خاں کی شادی ۱۹۳۲ء میں شاہ بانو بیگم (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض قباحتیں

۱۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ شروع کر دے کہ اس کا معاشی بوجھ ایک بالکل اجنبی شخص پر ڈال دیا جائے تو دنیا اسے مذاق یا عقل کا فتور سمجھے گی۔ اس لیے کہ کسی فرد پر دوسرے فرد کی کوئی ذمہ داری ڈالنے کے لیے کوئی معقول بنیاد ہونی چاہیے۔ دو اجنبی اشخاص کے درمیان اس طرح کی بنیاد نہیں ہوتی۔ اسلام کے نزدیک جن بنیادوں پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں سے ایک بنیاد نکاح ہے۔ نکاح کے بعد عورت ازدواجی زندگی کے وسیع تقاضوں کی تکمیل

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) سے ہوئی۔ ازدواجی زندگی کے ۴۳ سال بعد ۱۹۷۵ء میں شوہر نے بیوی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اپریل ۱۹۷۸ء میں شاہ بانو بیگم نے اپنے شوہر کے خلاف اندور (مدھیہ پردیش) کے جوڈیشیل مجسٹریٹ کی عدالت میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت عذرداری داخل کر دی۔ جس میں پانچ سو روپئے ماہانہ کے حساب سے نان ونفقہ دلانے کی درخواست کی گئی تھی۔ ۶ر نومبر ۱۹۷۸ء کو محمد احمد خاں نے شاہ بانو بیگم کو طلاق مغلظہ دے دی۔ مدعی علیہا کے نفقہ کی درخواست کے جواب میں محمد احمد خاں کی دلیل یہ تھی کہ طلاق مغلظہ کے بعد مدعی علیہا کی حیثیت بیوی کی نہیں رہی۔ اس لیے اس پر نان ونفقہ ادا کرنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اگست ۱۹۷۹ء میں جوڈیشیل مجسٹریٹ نے اپنا فیصلہ دیتے ہوئے محمد احمد خاں کو نفقہ کے طور پر ۲۵ روپیہ ماہانہ شاہ بانو کو دینے کی ہدایت کی۔ محمد احمد کی طرف سے مجسٹریٹ کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست مدھیہ پردیش ہائی کورٹ میں داخل کی گئی۔ ہائی کورٹ نے جوڈیشیل مجسٹریٹ کے فیصلہ کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بطور نفقہ ادا کی جانے والی رقم ۲۵ روپئے سے بڑھا کر ۱۷۹ روپیہ ۲۰ پیسے مقرر کر دی۔ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف محمد احمد خاں نے سپریم کورٹ میں خصوصی اپیل دائر کی۔ پانچ نفری آئینی بنچ نے اس خصوصی اپیل پر طویل سماعت کے بعد مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اپیل خارج کر دی اور اس فیصلہ کو برقرار رکھا کہ مطلقہ مسلم بیوی کو عدت گزر جانے کے بعد بھی نان ونفقہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ یہ فیصلہ اپریل ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آیا۔ (ہفت روزہ دعوت مسلم پرسنل لا نمبر مورخہ ۱۴ر جون ۱۹۸۵ء کے مضمون مقدمہ کا تعارف سے ماخوذ)

محترمہ شاہ بانو قابل صد ستائش ہیں کہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ عدالت عالیہ کا فیصلہ گو ان کے حق میں ہوا ہے لیکن یہ خدا کے قانون کے خلاف ہے تو انھوں نے عدالت سے اس فیصلہ کو واپس لینے کا مطالبہ کر کے ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی ہے۔

اور خاندان کی تعمیر کے لیے مرد کو اپنا وقت دیتی اور اپنی صلاحیت صرف کرتی ہے، مرد اس کے عوض اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ جب تک دونوں عقد نکاح میں بندھے ہوئے ہیں یہ ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ طلاق سے میاں بیوی کا یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور دوسری طرف مرد اس کی معاشی ذمہ داری سے سبک دوش ہوجاتا ہے اور دونوں کے درمیان ایک طرح کی دوری اور اجنبیت حائل ہوجاتی ہے۔ اگر طلاق مغلظہ ہے تو یہ اجنبیت اتنی سخت ہوتی ہے کہ عورت جتنی آسانی سے دوسرے مرد سے اور مرد دوسری عورت سے شادی کرسکتا ہے اتنی آسانی سے یہ دونوں دوبارہ اپنے ازدواجی تعلقات بحال نہیں کرسکتے۔ وہ ان تعلقات کو بحال کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ عورت کی کسی دوسرے شخص سے شادی ہو اور وہ طلاق دے دے یا اس کا انتقال ہوجائے۔ اس کے بغیر وہ چاہیں بھی تو اپنی سابقہ زندگی کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔ طلاق کے ذریعہ جہاں اتنی زبردست دوری پیدا ہوجائے اور اجنبیوں سے بھی زیادہ اجنبیت حائل ہوجائے وہاں ان میں سے کس پر کس کے حقوق عائد کیے جائیں اور کون کس کی ذمہ داری اٹھائے؟

۲۔ میاں بیوی کے درمیان طلاق کی نوبت بالعموم اس وقت آتی ہے جب کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتتے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق نہیں پہچانتے۔ اس کی وجہ سے خانگی زندگی میں تعاون اور اشتراک باقی نہیں رہتا اور عدم تعاون اور مخالفت شروع ہوجاتی ہے۔ لیکن طلاق کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے جیسے لازماً یہ مرد کی ایک زیادتی ہے۔ اور عورت کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ حالانکہ اس امکان کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ عورت نے ایسے حالات پیدا کردیئے ہوں کہ مرد کو مجبوراً طلاق دینی پڑی ہو۔ اس کے باوجود مرد پر مطلقہ کا تاحیات نفقہ لازم قرار دینا اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے جس کا کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں ہے۔

۳۔ طلاق کے بعد جس طرح عورت مرد کے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ نہیں ہوتی اسی طرح مرد بھی فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ عورت کی ساری ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوجائے۔ اگر طلاق کے بعد عورت کی معاشی ذمہ داری اس پر برقرار رہے تو بعض اوقات

طلاق نہ دینا اس کے لیے طلاق دینے سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ طلاق دے کر بھی بیوی کی زندگی بھر اس کی معاشی ذمہ داری اٹھانے کی جگہ وہ اس بات کو ترجیح دے سکتا ہے کہ طلاق نہ دے کر اسے معلقہ بنائے رکھے اور عملاً تمام حقوق سے محروم کر دے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ معلقہ عدالت سے حقوق حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن ایک تو عدالت سے کسی حق کا حاصل کرنا آسان نہیں ہے، دوسرے یہ کہ مرد اس سے بچنا چاہے تو ہزار تدبیریں کر سکتا ہے، تیسرے یہ کہ یہ کون سی دانش مندی ہے کہ مطلقہ کے نفقہ کو لازم کر کے طلاق کو اس قدر دشوار کر دیا جائے کہ آدمی طلاق کے بعد نفقہ کے ڈر سے طلاق ہی نہ دے اور بیوی کو لٹکائے رکھے۔ ایک غلطی کو باقی رکھنے کے لیے دوسری غلطی کا ارتکاب کرنا کوئی معقول بات تو نہیں ہے۔

۴۔ طلاق کے بعد عورت اور مرد دونوں کو یہ آزادی حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی دوسرے فرد کو اپنا رفیق حیات بنالیں اور طلاق کی وجہ سے زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پر کریں لیکن طلاق دینے کے بعد بھی آدمی کو بیوی کا معاشی بوجھ اٹھانا پڑے تو وہ دوسرے نکاح کی مشکل ہی سے ہمت کر سکتا ہے۔ سابقہ بیوی اور موجودہ بیوی دونوں کے اخراجات اٹھانے کے مقابلہ میں وہ شاید تجرد کی زندگی کو ترجیح دے گا۔ اس سے اس کی سیرت و اخلاق کے خراب ہونے اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہونے کا خطرہ ہے۔

۵۔ اس میں عورت کے بگاڑ کا بھی اندیشہ ہے۔ اگر عورت کو یہ یقین ہو کہ طلاق کے بعد بھی اس کا نفقہ اسے برابر ملتا رہے گا تو اس کے اندر مرد کو بات بات پر تنگ کرنے اور ذرا ذرا سی شکایات پر طلاق حاصل کرنے کا رجحان ابھر سکتا ہے۔ چنانچہ مغرب میں طلاق کا اوسط جن اسباب کی بنا پر بہت بڑھ گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عورت کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ وہ طلاق کے بعد بھی (Maintenance) کے نام پر زندگی بھر شوہر سے اپنا خرچ وصول کرتی رہے گی۔ اسلام طلاق کے رجحان کو غلط سمجھتا ہے۔ وہ ایسے کسی قاعدہ ضابطہ کی تائید ہرگز نہیں کر سکتا جس سے اس رجحان کو تقویت ملے اور ازدواجی زندگی کی ناگواری کو طلاق کے ذریعہ دور کیا جانے لگے۔

۶۔ ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ طلاق سے عورت اور مرد ایک دوسرے کے

لیے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی نفقہ جاری رہنے سے فطری طور پر یہ اجنبیت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ پرانے زخم مندمل ہونے لگتے ہیں، ملاقاتیں شروع ہو جاتی ہیں، دونوں طرف سے ہمدردی اور محبت کا اظہار ہونے لگتا ہے اور بے تکلفی بڑھنے لگتی ہے۔ ان کے درمیان جنسی تعلقات میں چونکہ پہلے سے کسی قسم کا حجاب موجود نہیں ہوتا اس لیے بسا اوقات یہ بے تکلفی اور میل جول غلط رخ اختیار کرنے لگتی ہے۔ ایک ایسی صورتِ حال کا باقی رہنا جس میں اخلاقی بگاڑ کا سخت اندیشہ ہو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اس بات کا انتظام ہو سکتا ہے کہ دونوں میں براہ راست تعلقات پیدا نہ ہوں۔ لیکن کم از کم جہاں دونوں ایک مقام پر رہتے ہوں وہاں یہ بہت دشوار ہے۔ اس کے بڑے غلط نتائج دیکھنے میں آتے رہتے ہیں بلکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بغیر کسی روک ٹوک کے دونوں ساتھ رہنے لگتے ہیں اور معاشرہ بھی اسے برداشت کر لیتا ہے۔ شریعت کے مزاج کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کے لیے ایسے حالات نہ پیدا کیے جائیں کہ وہ بے راہ روی میں آگے نکلتا چلا جائے اور اسے اس کا احساس بھی نہ ہو۔

یہ بعض وہ معاشرتی اور سماجی پیچیدگیاں ہیں جو مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینے سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان پیچیدگیوں کو نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

مطلقہ کے حقوق

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ طلاق کے بعد عورت کے تاحیات نفقہ کو کسی نہ کسی طرح قرآن سے ثابت کر دکھائیں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ قرآن مجید ان کی اس خواہش کو پوری کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے۔ طلاق کی صورت میں عورت کے مہر، نفقہ اور عدت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان کے احکام موجود ہیں، لیکن ان میں مطلقہ کے تاحیات نفقہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

۱۔ مہر

مہر کے مسئلہ پر اس سے پہلے بحث گزر چکی ہے۔ اس کی چار شکلیں ہیں۔ مہر متعین ہے اور

عورت سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہے تو اسے پورا مہر ملے گا، مہر متعین نہیں ہے اور خلوت ہو چکی ہے تو عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی، مہر متعین تو ہے لیکن خلوت صحیحہ نہیں ہوئی ہے تو نصف مہر ملے گا، اگر مہر بھی متعین نہیں ہے اور خلوت بھی نہیں ہوئی ہے تو اسے متاع دیا جائے گا۔[1]

عدت کی تعیین

جہاں تک زمانہ عدت کا تعلق ہے، اس کی تعیین بھی قرآن مجید نے کر دی ہے۔
اگر خلوت صحیحہ کے بعد طلاق ہوئی ہے تو عدت تین حیض ہے (البقرہ: ۲۲۸)
جس عورت کو صغر سنی کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہ آئے اس کی عدت تین ماہ ہے اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے (الطلاق: ۴)
اگر خلوت صحیحہ سے پہلے ہی طلاق ہو چکی ہے تو اس کی کوئی عدت نہیں ہے (الاحزاب: ۴۹)[2]

۲۔ عدت تک نفقہ

اب نفقہ اور سکنیٰ (مکان) کے مسئلہ کو لیجئے۔
طلاق دو طرح کی ہوتی ہے۔ رجعی جس میں شوہر کو رجوع کا حق ہوتا ہے۔ بائن جس میں رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مختصر احکام یہ ہیں۔
۱۔ طلاق رجعی ہو تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ عورت کو نفقہ اور سکنیٰ (مکان) دونوں ملیں گے۔
۲۔ فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ عورت اگر حاملہ ہے تو اس کا نفقہ اور سکنیٰ واجب ہے۔ چاہے طلاق رجعی ہو یا بائن۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: ۶)	اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب میں 'مہر کی نوعیت اور اس کے احکام'۔

[2] ملاحظہ ہو اسی کتاب میں 'طلاق کا مسئلہ'۔

۲۔ اگر عورت حاملہ نہیں ہے اور طلاق بائنہ ہے تو امام احمدؒ داؤد ظاہری اور ابوثور وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ شوہر پر نہ تو اس کا نفقہ واجب ہے اور نہ سکنیٰ۔ ان حضرات کی دلیل حضرت فاطمہ بنت قیس کی روایت ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق بائن دے دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَیْسَ لَكِ عَلَیْهِ نَفَقَةٌ[1] (تمہارے شوہر پر تمہارا نفقہ واجب نہیں ہے) ایک اور روایت کے الفاظ میں لا نفقة لكِ ولا سکنیٰ[2] (تمہیں نہ نفقہ ملے گا اور نہ سکنیٰ)

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے اس کے سکنیٰ کا ذکر کیا ہے (الطلاق: ۶) لہٰذا اسے سکنیٰ تو ملے گا نفقہ نہیں ملے گا۔

ابن رشدؒ مسلک کے لحاظ سے مالکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے ایک کمزور رائے قرار دیتے ہیں[3]۔ اس معاملہ میں احناف کا مسلک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ احناف اور بعض دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ طلاق چاہے رجعی ہو یا بائن عورت کو نفقہ اور سکنیٰ دونوں ملیں گے۔ احناف کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے مطلقہ کے لیے سکنیٰ کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نفقہ اسی کے تابع ہے۔ قرآن نے اس بات کا پابند بنایا ہے کہ آدمی طلاق کے بعد عدت تک عورت کو گھر میں رکھے لہٰذا اس کا خرچ بھی فطری طور پر اسی کو اٹھانا چاہیے۔ سکنیٰ کی بنیاد پر بیوی کا نفقہ بھی آدمی پر لازم آتا ہے۔ آیت کے الفاظ سے اسی کی تائید ہوتی ہے:

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم	ان عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے
مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ	کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو۔ اور ان کو تنگ
لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ (الطلاق: ٦)	کرنے کے لیے تکلیف نہ پہنچاؤ۔

جصاص کہتے ہیں کہ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ یہ مطلقہ رجعیہ اور مطلقہ بائنہ دونوں کے متعلق ہیں۔ مِنْ وُجْدِكُمْ (اپنی وسعت اور طاقت کے لحاظ سے)[4] کے الفاظ بتاتے ہیں کہ

---

[1] مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لہا۔ [2] حوالہ سابق۔ [3] بدایۃ المجتہد ۲/۱۰۳

[4] زمخشری: الوجد: الوسع والطاقة۔ الکشاف ۲-۱۴۹۰۔

شوہر کے مال میں مطلقہ کا سکنیٰ واجب کیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ مال میں نفقہ بھی واجب ہو اس لیے کہ سکنیٰ نفقہ کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے یہ ہدایت کہ ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ پہونچاؤ۔ تنگ کرنا اور تکلیف پہونچانا یہ دونوں باتیں جس طرح سکنیٰ سے متعلق ہیں نفقہ سے بھی متعلق ہیں[1]

فاطمہ بنت قیس کی روایت کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اسے حضرت عمرؓ نے قبول نہیں کیا اور فرمایا:۔

لانترك كتاب الله وسنة نبينا	ہم اللہ کی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
صلى الله عليه وسلم لقول	کی سنت کو ایک عورت کے بیان کی وجہ
امرأة لاندري لعلها	سے چھوڑ نہیں سکتے معلوم نہیں اس نے اسے
حفظت او نسيت لها السكنى	(ٹھیک سے) یاد بھی رکھا یا بھول گئی۔ مطلقہ کے
والنفقة[2]	لیے سکنیٰ (مکان) بھی ہے اور نفقہ بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک کتاب وسنت سے مطلقہ کا نفقہ اور سکنیٰ دونوں ثابت ہے[3]

اس لیے یہ مسئلہ بالکل واضح ہے کہ مطلقہ کا اس کی عدت تک نفقہ اور سکنیٰ شوہر پر واجب ہے۔ عدت کے بعد نفقہ یا سکنیٰ کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

مطلقہ کے لیے متاع

جو لوگ قرآن مجید سے مطلقہ کے نفقہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۱ سے استدلال کرتے ہیں وہ آیت یہ ہے:۔

---

[1] جصاص: احکام القرآن ۵۶۵/۳ [2] مسلم، کتاب الطلاق، باب المطلقۃ البائن لانفقۃ لہا

[3] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: بدایۃ المجتہد ۱۰۲/۲، ۱۰۳۔ جصاص: احکام القرآن ۵۶۴/۳ – ۵۷۰۔ ابن قدامہ: المغنی ۶۰۹/۷، ۶۱۰

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ — جن عورتوں کو طلاق دی گئی انھیں دستور کے مطابق متاع دینا ہے۔ یہ حق ہے متقیوں پر

اس آیت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ اس میں مطلقات کے لیے مہر کے علاوہ 'متاع' دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ طلاق کے بعد جب تک عورت زندہ ہے اسے یہ متاع ملنا چاہیئے تاکہ وہ اس سے گزر بسر کر سکے۔ قرآن مجید نے 'متاع' کا حکم تو دیا ہے لیکن اس کی تعیین نہیں کی ہے۔ اسے رواج اور دستور پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے حسب حالات متعین کیا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں اگر اسے تاحیات یا تا نکاح ثانی نفقہ کی شکل میں متعین کیا جائے تو یہ قرآن کے منشا کے مطابق ہوگا اس کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس کی ادائیگی یک مشت بھی ہو سکتی ہے اور قسطوں میں بھی لیکن اسے لازم بہر حال ہونا چاہیئے۔

'متاع' کے اس عجیب و غریب معنی کی تائید نہ تو لغت عرب سے ہوتی ہے، نہ قرآن مجید کے سیاق و سباق سے اور نہ صحابہ و تابعین اور فقہاء امت نے اس کے یہ معنی لیے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت میں مطلقہ کے لیے جس 'متاع' یا 'متعہ' کا ذکر کیا گیا ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے حسب ذیل سوالات پر غور کرنا ہوگا۔

۱۔ 'متاع' کیا ہے؟

۲۔ اس کی حیثیت اخلاقی ہے یا قانونی؟

۳۔ قانونی ہے تو کیا یہ ہر قسم کی مطلقہ کے لیے ہے یا بعض مطلقات کے لیے؟

متاع کا لغوی مفہوم

'متاع' لغت میں تھوڑے سے ساز و سامان کو اور اس چیز کو جس سے وقتی طور پر فائدہ اٹھایا جائے، کہا جاتا ہے۔ ازہری کہتے ہیں:-

المتاع فی اللغۃ کل ما انتفع بہ فھو متاع[1] — متاع لغت میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

---

[1] لسان العرب مادہ 'متع'۔

امام راغب کہتے ہیں:

المتاع انتفاع ممتد الوقت[1] — ایک خاص وقت تک فائدہ اٹھانا متاع ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

کل ما ینتفع بہ علی وجہ ما فھو متاع ومتعۃ[2] — ہر وہ چیز جس سے کسی بھی نوعیت کا فائدہ اٹھایا جائے 'متاع' یا متعہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

اصل المتعۃ والمتاع ما ینتفع بہ انتفاعاً غیر باق[3] — 'متعہ' اور 'متاع' اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے ایسا فائدہ اٹھایا جائے جو باقی رہنے والا نہیں ہے بلکہ جلد ہی ختم ہونے والا ہے۔

قرآن میں لفظ متاع کا استعمال

قرآن مجید میں 'متاع' کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہوا ہے۔ گھر کے اندر استعمال ہونے والی اشیاء۔ چنانچہ اجنبی اشخاص کو ازواج مطہرات سے ایسی کوئی چیز لینے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے:

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الاحزاب: ۵۳) — جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو ان سے پردہ کے پیچھے سے مانگو۔

دھات سے بنی ہوئی چیزیں جیسے برتن اور اوزار وغیرہ۔

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ (الرعد: ۱۷) — جن دھاتوں کو یہ آگ میں تپاتے ہیں زیور بنانے یا کسی بھی سامان کے لیے اسی طرح جھاگ ہوتا ہے۔

---

[1] المفردات فی غریب القرآن: مادہ متع [2] حوالہ سابق [3] تفسیر کبیر: ۲/ ۲۸۴

سورہ یوسف میں ایک جگہ یہ لفظ پیالے یا پیمانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے (۷۹) اسی سورہ میں شکاری کے سازو سامان کے معنی میں آیا ہے (۱۷) سورہ مائدہ میں سمندر کے شکار — مچھلی وغیرہ — کو 'متاع' کہا گیا ہے (۹۶)

اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ساتھ زندگی کے ان تمام اسباب کو بھی 'متاع' کہا گیا ہے جن سے انسان اس زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ	اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ
إِلَىٰ حِينٍ (البقرہ: ۳۶)	اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک۔

پوری دنیا کو اس کے تمام سازو سامان، زر و جواہر اور اسبابِ آسائش و راحت کے باوجود 'متاع' کہا گیا ہے۔

وَإِن كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَوٰةِ	یہ ساری چیزیں تو دنیا کی زندگی کی متاع
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ	ہیں اور آخرت تمہارے رب کے نزدیک
لِلْمُتَّقِينَ ۝ (الزخرف: ۳۵)	متقیوں کے لیے ہے۔

یہاں آخرت کے مقابلے میں حیاتِ دنیا کو 'متاع' کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی ابدی زندگی اور وہاں کی نعمتوں کو سامنے رکھا جائے تو دنیا ایک 'متاع' اور وہ بھی 'متاع قلیل' ہے۔

وَمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ	دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں محض
إِلَّا مَتَاعٌ (الرعد: ۲۶)	حقیر متاع ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا فِي	دنیا کی زندگی تو آخرت کے مقابلہ بہت
الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ (التوبہ: ۳۸)	تھوڑی سی ہے۔

متاعِ طلاق

اب یہ دیکھیے کہ 'متاع طلاق' کے کیا معنی ہیں؟ قرآن مجید نے 'متاع طلاق' کا حکم

بغیر کسی قید کے مطلق دیا ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ 'متاع' سے اس کی کیا مراد ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر 'متاع' کو ضروری بھی قرار دیا جائے تو 'طلاق' کے وقت کوئی بھی چھوٹی بڑی چیز عورت کو دے دینے سے اس کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔

اُن ماہرین لغت نے جنھوں نے خاص طور پر قرآن اور حدیث کے الفاظ کی تحقیق کی ہے 'متاع طلاق' کے معنی یہ نہیں لئے ہیں کہ مطلقہ کو تاحیات نفقہ دیا جائے یا کسی خاص مدت تک اس کے اخراجات برداشت کیے جائیں۔ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ عورت کی دلجوئی کے لیے کچھ دے دلا دیا جائے۔

امام راغب الفاظ قرآن کے بلند پایہ محقق ہیں 'متاع طلاق' کے بارے میں فرماتے ہیں۔

....فالمتاع والمتعۃ مایعطی المطلقۃ لتنتفع بہ مدۃ عدتہا [1]	شوہر اپنی مطلقہ کو عدت کے زمانہ میں فائدہ اٹھانے کے لیے جو دیتا ہے وہ متاع یا متعہ ہے۔

گویا وہ عدت کے زمانے کے نفقہ ہی کو 'متاع' سمجھتے ہیں اس کے علاوہ کسی 'متاع' کا قانونی طور پر اسے مستحق قرار نہیں دیتے (اس مسئلہ میں فقہاء کی رائیں آگے آرہی ہیں)

الفاظ حدیث کے بہت بڑے ماہر علامہ ابن اثیر نے 'متاع طلاق' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

ولیستحب للمطلق ان یعطی امرأتہ عند طلاقہا شیئا یھبہا ایاہ [2]	طلاق دینے والے کے لیے یہ پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے وقت کوئی چیز اسے ہبہ کر دے۔

علامہ سیوطی نے لغات حدیث پر ابن اثیر کی کتاب کی تلخیص کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں۔

متعۃ الطلاق إعطاءھا شیئا یجبر بہ کسرھا [3]	متعہ طلاق یہ ہے کہ عورت کو کوئی چیز دے دی جائے تاکہ اس کی دل شکنی کی تلافی ہو۔

---

[1] المفردات فی غریب القرآن مادہ 'متع'۔ [2] النہایہ فی غریب الحدیث: ۴/۲۷ مادہ متع۔
[3] الدر النثیر علی ہامش النہایہ مادہ 'متع'۔

قرآن مجید نے مطلقہ کے 'متاع' کا ذکر جس سیاق میں کیا ہے اس سے بھی اس کی مراد واضح ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ خلوت سے پہلے جس عورت کو طلاق دی جائے اگر اس کا مہر متعین ہے تو وہ نصف مہر کی مستحق ہوگی اور مہر متعین نہیں ہے تو اسے 'متاع' دیا جائے گا (البقرہ: ۲۳۶، ۲۳۷) اگر مہر کا تصور زندگی بھر کے نفقہ کا نہیں ہے تو 'متاع' کے اندر یہ مفہوم کہاں سے آجائے گا کہ مطلقہ کو تاحیات نفقہ فراہم کیا جائے؟

متاع سے نفقہ مراد نہیں لیا جا سکتا

یوں بھی اس لفظ سے تاحیات نفقہ مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ قرآن مجید نے صراحت کر دی ہے کہ طلاق کے بعد عدت تک عورت کا نفقہ او رسکنیٰ (مکان) مرد پر واجب ہے۔ اس کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود مرد پر نفقہ کو مطلقہ کے نکاح ثانی یا موت تک واجب قرار دینا قرآن کے حکم پر ایک اضافہ ہے جو صحیح نہیں ہے۔ جس ذمہ داری سے اللہ تعالیٰ نے بہت سی مصلحتوں کے پیش نظر مرد کو سبکدوش کیا ہے وہی ذمہ داری اس پر دوبارہ عائد کرنا ان مصلحتوں کو پامال کرنا ہے۔

۲۔ اس سے پہلے یہ بحث گزر چکی ہے کہ نکاح کے بعد عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری مرد پر اس لیے عائد ہوتی ہے کہ عورت خاندان کی تعمیر کے لیے اسے اپنا سارا وقت دیتی ہے۔ طلاق کے بعد جب عورت آزاد ہوگئی اور اس کے اوقات پر مرد کا کوئی قبضہ نہیں رہا تو پھر نفقہ کس بنیاد پر واجب ہوگا؟

صحابہ و تابعین کی رائے

اب آیئے اس معاملہ میں صحابہ و تابعین کی رائے اور ان کا طرز عمل دیکھا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مطلقہ کے متاع کا سب سے اعلیٰ معیار یہ ہے کہ اسے خادم دیا جائے۔ اس سے کم تر یہ ہے کہ ایک جوڑا لباس (جس میں تین کپڑے ہوں) دیئے جائیں۔ آخری چیز یہ ہے کہ تھوڑی سی چاندی (رقم) دی جائے۔ حضرت عبداللہ

بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس کی مقدار کم سے کم تیس درہم ہونی چاہیے۔

تابعین میں قاضی شریح نے متاع کو پانچ ہزار درہم بتایا ہے۔ امام شعبی نے اسے گھر کے اندر کا پورا لباس، لحاف اور جلباب (چادر) کہا ہے۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ متعہ کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے۔ آدمی اپنی حیثیت کے مطابق دے گا۔ عطاء بن ابی رباح نے بھی یہی بات کہی ہے۔

ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض بزرگوں نے مطلقہ کا خوش دلی سے بہت زیادہ تعاون کیا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنی بیوی تماضر کو طلاق دی تو اسے متاع میں ایک سیاہ فام لونڈی دی۔

حضرت حسنؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنی ایک بیوی کو طلاق دی تو اسے متاع کے طور پر دس ہزار درہم دیئے[1]

اس طرح کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ ان کی حیثیت حسن سلوک اور ایک طرح کے احسان کی ہے۔ اسے قانون نہیں بنایا جا سکتا۔

فقہاء کا نقطہ نظر

فقہاء کرام نے اپنے حالات کے لحاظ سے اس کے تعیین کی کوشش کی ہے۔

فقہ حنفی میں ہے کہ مطلقہ کا متاع یہ ہے کہ اسے ایک جوڑا لباس دیا جائے۔ اس میں کتنے کپڑے ہوں اس کا تعلق معاشرہ کے دستور اور رواج سے ہے۔ کپڑے کا معیار: ایک رائے یہ ہے کہ شوہر کی حیثیت کے مطابق ہوگا دوسری رائے یہ ہے کہ اس میں شوہر اور بیوی دونوں کی حیثیت دیکھی جائے گی۔ اس کے ساتھ فقہاء احناف کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ یہ متاع مہر مثل کے نصف سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ اسی کی جگہ رکھا گیا ہے اور پانچ

---

[1] ان اقوال کے لیے ملاحظہ ہو ابن جریر: ۲/۳۰۴-۳۰۵، ابن کثیر: ۱/۲۸۸۔ المحلی: ۱۰/۲۴۸

درہم سے کم بھی نہیں ہونا چاہیئے[1] (اس لیے کہ فقہ حنفی کی رو سے مہر کی مقدار کم از کم دس درہم ہونا چاہیئے۔ اگر اسے مہر مثل کا نصف مان لیا جائے تو یہ ایک جوڑے سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے)

فقہ مالکی میں کہا گیا ہے کہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد آدمی اپنی حیثیت کے مطابق مہر کے علاوہ جو بھی دے وہ متعہ ہے[2]

امام شافعی نے متعہ کی تعیین اس طرح کی ہے۔ صاحب حیثیت کے لیے ایک خادم، اوسط درجہ کے آدمی کے لئے ایک جوڑا کپڑے۔ اس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ تیس درہم یا اس کی قیمت کی کوئی چیز دی جائے۔ اس کے ساتھ میاں بیوی کو اس کا حق ہے کہ وہ اس سے کم یا زیادہ پر اتفاق کر لیں[3]

تقریباً یہی بات فقہ حنبلی میں کہی گئی ہے کہ متعہ مرد کی حیثیت کے مطابق ہوگا۔ اس کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ خادم دیا جائے اور کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایک جوڑا دیا جائے جس میں اتنے کپڑے ہوں کہ وہ نماز کے لیے کافی ہو سکیں۔ شوہر اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہے اور عورت اس سے کم بھی لے سکتی ہے[4]

فقہاء نے اپنے دور کو سامنے رکھ کر متاع کے تعین کی کوشش کی ہے۔ اس میں کمی بیشی ہر دور کے حالات کے لحاظ سے ہو سکتی ہے۔ قرآن و حدیث میں جس طرح مہر اور نفقہ کی کوئی حد بندی نہیں ہوئی ہے اسی طرح متعہ کی بھی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اسے ہر دور کے حالات پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں صحابہ و تابعین کے درمیان جو اختلاف رہا ہے اس کے بارے میں علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں :

ھذہ المقادیر کلھا صدرت	متعہ کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں وہ سب
عن اجتھاد آرائھم ولم ینکر	کی سب سلف کی اجتہادی رائیں ہیں
بعضھم علی بعض ما صار	ان میں سے جس نے جو رائے اختیار کی

---

[1] ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۶۶۲ [2] الشرح الصغیر ۲/۶۱۶

[3] بغوی: معالم التنزیل ۱/۲۰۴ خطیب شربینی: السراج المنیر: ۱/۱۵۲ [4] ابن قدامہ: المغنی ۶/۷۱۶

الیہ من مخالفتہ فیہ فدل	اس پر دوسرے نے اس لیے نکیر نہیں کی کہ
علی انہا عندھم موضوعۃ	خود اس نے اس کی رائے کے خلاف رائے
علی مایؤدیہ الیہ اجتہادہ[۱]	اختیار کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ساری
	رائیں ان کے اجتہاد کا نتیجہ ہیں۔

بعض فقہاء کے نزدیک متعہ کی تعیین میں عورت کی سماجی ومعاشی حیثیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ صرف مرد کی حیثیت دیکھی جائے گی۔ اس لئے کہ قرآن نے کہا ہے کہ "صاحبِ حیثیت اپنی حیثیت کے لحاظ سے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے لحاظ سے متاع دے" (البقرہ: ۲۳۶)

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عورت اور مرد دونوں کی حیثیت پیش نظر رکھی جائے گی۔ جصاصؒ کہتے ہیں متعہ کی تعیین میں معروف کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بات معروف کے خلاف ہے کہ اس میں عورت کی حیثیت کی رعایت نہ کی جائے اور ایک خوش حال گھرانے کی عورت کو وہی متعہ دیا جائے جو ایک غریب خاندان کی عورت کو دیا جاتا ہے۔[۲]

اس پوری بحث سے اتنی بات واضح ہے کہ 'متاع' دراصل اس ساز وسامان کو کہا جاتا ہے جو طلاق کے وقت حسبِ حیثیت عورت کی دل جوئی کے لیے دیا جاتا ہے۔ اسے بڑھا کر پوری زندگی کا نفقہ بنا دینا اس لفظ کے ساتھ ایسی کھلی ہوئی زیادتی ہے کہ اس کی کسی سنجیدہ آدمی سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

متاع کی حیثیت اخلاقی ہے یا قانونی

اب اس سوال کو لیجئے کہ متاع کی حیثیت اخلاقی ہے یا قانونی؟

اس مسئلہ میں امام مالک کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق دی جائے اسے متعہ دینا مندوب (پسندیدہ) ہے فرض نہیں ہے۔ ان کی دلیل 'حقا علی المتقین' کے

۱۔ احکام القرآن: ۱/۵۱۵ ۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احکام القرآن: ۱/۵۱۳ - ۵۱۵

الفاظ میں جو آیت کے آخر میں آئے ہیں۔ اس سے پہلے آیت نمبر ۲۳۶ میں متعہ کو 'حقاعلی المحسنین' (نکوکاروں پر حق ہے) کہا گیا ہے۔ جو چیز تقویٰ اور احسان کی علامت ہے اسے ہم سب پر فرض قرار نہیں دے سکتے[1]

تابعین میں قاضی شریح کی یہی رائے تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو جس سے خلوت ہو چکی تھی طلاق دی۔ قاضی شریح کی عدالت میں اس عورت نے متعہ کا دعویٰ کیا تو انھوں نے اس کے شوہر سے کہا کہ محسنین کے زمرے میں شامل ہونے سے اور متقیوں کے زمرہ میں شامل ہونے سے انکار نہ کرو۔ اسے متعہ دینے پر مجبور نہیں کیا[2]

امام مالک کے نزدیک خلوت سے پہلے جس عورت کی طلاق ہو جائے اور اس کا مہر متعین ہو اسے نصف مہر ملے گا اسے متعہ نہیں ہے۔

امام مالک کی ایک رائے یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ متعہ واجب ہے لیکن معروف رائے وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے[3]

فقہاء کی اکثریت نے مطلقہ کے لیے متاع کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بصیغۂ امر اس کا حکم دیا ہے مَتِّعُوهُنَّ (البقرہ ۲۳۶ - الاحزاب ۴۹) انھیں متاع دو۔ جب تک کوئی مضبوط قرینہ نہ ہو صیغۂ امر سے وجوب ہی سمجھا جائے گا۔

قرآن نے فرمایا 'وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ' (مطلقات کے لیے متاع ہے) اس سے بھی وجوب ہی ثابت ہوتا ہے۔ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ (مطلقات کے لیے) یہ لفظ بتاتا ہے کہ متاع ان کی ملکیت ہوگی اور وہ اس کا مطالبہ کر سکیں گی۔

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (متقیوں پر حق ہے) کے الفاظ بھی وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متعہ متقیوں پر فرض ہے اسی کی تاکید کے طور پر فرمایا حقا علی المحسنین (محسنوں پر حق ہے)۔

---

[1] احمد الدردیر: الشرح الصغیر ۲/ ۲۱۷ - ۲۱۸ [2] بغوی: معالم التنزیل علی ہامش الخازن ۱/ ۲۰۴

[3] الشرح الصغیر ۲/ ۶۱۷ -

کیا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ صرف متقیوں یا محسنوں پر فرض ہے۔ دوسروں پر فرض نہیں ہے؟ اس کے جواب میں علامہ ابوبکر جصاص نے قرآن مجید کے نظائر سے ثابت کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو متقی اور محسن نہیں ہیں ان پر یہ فرض نہیں ہے بلکہ اس انداز سے اس حکم میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی اس پر عمل کر کے نیک لوگوں کے زمرہ میں شامل ہو جائے۔[1]

کیا ہر مطلقہ کے لئے متاع واجب ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ متعہ واجب ہے تو کیا ہر مطلقہ کو متعہ دینا واجب ہے یا ان میں سے بعض کو متعہ دینا واجب ہے اور بعض کو واجب نہیں ہے؟

اس میں فقہ حنفی کی رائے یہ ہے کہ متعہ اس مطلقہ کا واجب ہے جس کا مہر متعین نہ ہوا اور جسے خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دے دی جائے۔ اس لیے کہ اسی کو قرآن نے متعہ دینے کا حکم دیا ہے (البقرہ: ۲۳۶) دوسری مطلقات کو مہر اور نفقہ ملتا ہے اس لیے ان کو متعہ دینا واجب نہیں ہے۔ البتہ مندوب ہے۔[2]

امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے۔[3]

امام شافعی فرماتے ہیں کہ متاع سب ہی مطلقات کو دینا واجب ہے سوائے اس مطلقہ کے جس کا مہر متعین ہوا اور جسے خلوت سے پہلے طلاق دے دی جائے۔ قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ اسے نصف مہر ملے گا۔[4] (البقرہ: ۲۳۷) صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہی رائے بیان کی جاتی ہے۔[5]

حضرت سعید بن جبیرؒ، ابو العالیہؒ، حسن بصریؒ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ ہر مطلقہ کو متعہ

---

[1] پوری بحث کے لیے دیکھئے۔ جصاص: احکام القرآن ۱/۵۰۸ - ۵۰۹ [2] ردالمحتار علی الدر المختار ۲/۶۶۱-۶۶۲

[3] تفصیل کے لیے دیکھی جائے ابن قدامہ: المغنی: ۶/۷۱۵ [4] بدایۃ المجتہد ۲/۱۰۵-۱۰۶

[5] بغوی: معالم التنزیل علی ہامش الخازن ۱/۲۰۴

دینا واجب ہے۔ اس لیے کہ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ (مطلقات کو معروف کے مطابق متاع دینا ہے) ایک عام حکم ہے۔ اسے کسی خاص قسم کی مطلقہ کے ساتھ مخصوص کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ صرف ان مطلقات کو متعہ ملے گا جن کا مہر متعین نہ ہو۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا مہر بھی متعین تھا اور ان سے خلوت بھی ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود طلاق کی صورت میں انھیں متاع دینے کا حکم ہے۔ ارشاد ہے۔

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ	اے نبی تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم
كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ	دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت چاہتی
زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ	ہو تو آؤ میں تمہیں متاع دوں اور اچھی طرح سے
اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب)	رخصت کر دوں[1]

یہ رائے حضرت علیؓ، امام زہری، ابراہیم نخعی، عطاء بن ابی رباح اور سفیان ثوری سے بھی نقل کی جاتی ہے[2]

اہل ظاہر کی بھی رائے یہی ہے۔ ابن حزم ظاہری کہتے ہیں کہ ہر طرح کی مطلقہ کے لیے متعہ واجب ہے، چاہے طلاق رجعی ہو یا بائنہ، خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، مہر متعین ہوا ہو یا نہ ہو، اس لیے کہ وللمطلقات متاع بالمعروف ایک عام حکم ہے۔ اسے خاص کرنا صحیح نہیں ہے[3]

یہ سب رائیں ایک ہی ہیں۔ تفصیلات میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے۔ جو لوگ مطلقہ کے لیے متعہ کو لازم قرار دینا چاہتے ہیں ممکن ہے وہ اس رائے کو دوسری رایوں کے مقابلہ میں ترجیح دیں لیکن اس میں دو ایک خرابیاں بہت واضح ہیں۔ ایک یہ کہ جس عورت کو خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق دی جائے اگر اس کا مہر متعین ہو تو اسے نصف مہر اور متعہ دونوں ملیں گے اور اگر مہر متعین نہ ہو تو اسے صرف متعہ ملے گا۔ یہ ایک طرح کی ناانصافی معلوم ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ متعہ کو ہر مطلقہ کے لیے واجب قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی مہر اور نفقہ کی طرح اس کا ایک لازمی حق ہے اور ازروئے قانون وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے اس

---

[1] ابن کثیر: تفسیر ۱/۲۸۸ [2] ابن حزم: المحلی ۱۰/۲۴۷ [3] حوالہ سابق صفحہ ۲۴۵

میں شک نہیں کہ اہل ظاہر اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے واضح ہے، متعہ کی نوعیت یہی ہے۔ مشہور مفسر ابن جریر طبری اسی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک ہر مطلقہ کے لیے مہر ہی کی طرح متعہ بھی واجب ہے۔ شوہر کے لیے اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ متعہ نہ دے تو مہر اور دوسرے قرضوں کی طرح اس کے لیے بھی اس کی قانونی گرفت ہوگی۔[1]

یہ رائے اس لحاظ سے کم زور معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی عدالتوں نے کبھی اس طرح کا فیصلہ نہیں کیا۔ امام شعبی فرماتے ہیں۔

واللہ ما رایت احدا حبس فیہا (فی المتعۃ) واللہ لوکانت واجبۃ لحبس فیہا القضاۃ[2]	قسم خدا کی میں نے نہیں دیکھا کہ کسی کو متعہ کے نہ دینے پر قید کیا گیا ہو۔ خدا کی قسم اگر یہ واجب ہوتا تو اس کے نہ دینے پر قاضی حضرات قید کی سزا ضرور دیتے۔

اوپر کے صفحات میں ہم نے 'متاع' کے معنی و مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سے تفصیل سے بحث کی ہے اور اس مسئلہ میں مختلف فقہاء کی رائیں بھی پیش کردی ہیں۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ نہ تو قرآن و حدیث سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ طلاق کے بعد آدمی پر عورت کی معاشی ذمہ داری برقرار رہتی ہے اور نہ سلف سے خلف تک کسی نے اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ ایک ایسا بے بنیاد فکر ہے جس کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔

مطلقہ کا معاشی مسئلہ

آخر میں اس سوال کو لیجیے کہ طلاق کے بعد عورت کہاں جائے گی، اس کا معاشی بوجھ کون اٹھائے گا؟ یہ سوال کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ جیسے طلاق ہوتے ہی مسلمان عورت

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن جریر طبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن ۲/ ۳۰۸ - ۳۰۹

[2] تفسیر ابن کثیر - ۱/ ۲۹۷

ایسی نازک صورت حال سے دوچار ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی حل نکالنا ضروری ہو گیا ہے۔ پھر اسے حل کرنے کے لیے طرح طرح کی تجویزیں پیش کی جاتی ہیں اور قرآن مجید سے نئے نئے نکتے نکالے جاتے ہیں۔ حالانکہ نکاح اور طلاق کا سلسلہ آج سے نہیں چودہ سو برس سے قائم ہے، طلاق بہرحال پہلے بھی ہوتی رہی ہے، نوجوان عورتوں کی بھی اور بڑی عمر والی عورتوں کی بھی، ان کے ساتھ مسائل بھی رہے ہیں۔ معقول بات یہ ہے کہ کم از کم یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی کہ اسلام نے ان مسائل کا کوئی حل پیش کیا ہے یا نہیں بلکہ یہ توقع رکھنی چاہیے کہ اس نے جہاں زندگی کے اور مسائل میں ہماری رہنمائی کی ہے اس مسئلہ میں بھی ضرور رہنمائی کی ہوگی۔ ان سب باتوں سے صرف نظر کر کے یہ خیال کرنا بلکہ یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ اسلام نے اس کا کوئی علاج ہی نہیں تجویز کیا ہے اور مسلمان مفکرین نے اس طویل عرصہ میں اس پر سوچا ہی نہیں ہے، ناواقفیت اور بے خبری کی ایک نادر مثال ہے۔

اسلام کے نزدیک طلاق کے بعد عورت کا اپنے شوہر سے تعلق بالکل ٹوٹ جاتا ہے اس لیے اس نے اس کے معاشی مسئلہ کو بھی اس کے سابق شوہر سے متعلق نہیں رکھا ہے بلکہ اسے دوسرے طریقوں سے حل کیا ہے۔

۱۔ یہ ایک بے بنیاد خیال ہے کہ جس عورت کو طلاق ہو جائے، اگر اسے اس کے سابق شوہر سے نان ونفقہ نہ دلوایا جائے تو اس کے گزر بسر کی کوئی صورت ہی نہیں رہ جائے گی اور وہ بھوکوں مر جائے گی۔ اس خیال کے پیچھے عورت کی ہمدردی سے زیادہ، شاید کچھ دوسرے محرکات کام کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ ایک واقعہ ہے، اور اسے اسلامیات کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ اسلامی قانون کے تحت عورت کے پاس مختلف ذرائع سے دولت آتی ہے۔ اس میں وراثت مہر اور وصیت وغیرہ شامل ہیں، اس لیے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان ذرائع سے جو دولت حاصل ہو اس سے وہ اطمینان کے ساتھ گزر بسر کر سکے۔

۲۔ ہم اس سے پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر سے عورت معاشی جدوجہد کے لئے گو مجبور نہیں ہے، لیکن اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ عورت کا اپنا کوئی

جائز ذریعہ معاش ہو۔ وہ ملازمت کر سکتی ہے، زراعت اور تجارت کر سکتی ہے، صنعت اور حرفت میں حصہ لے سکتی ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی حدود میں معاشی جد وجہد کا اسے پورا حق ہے، اس جد وجہد میں وہ کامیاب ہو تو اپنا بوجھ آسانی سے اٹھا سکتی ہے بلکہ دوسروں کا تعاون بھی کر سکتی ہے۔

۳۔ اسلام، انسان کے لیے ازدواجی زندگی کو بہت ضروری سمجھتا ہے۔ اس نے پورے معاشرہ کو ہدایت کی ہے کہ ازدواجی زندگی گزارنے میں افراد کی مدد کرے۔ حکم ہے

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ	تم میں سے جو بے شادی شدہ ہوں اور
مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ	تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے جو
(النور: ۳۲)	نیک ہوں، ان کے نکاح کر دو۔

آیت میں 'ایامیٰ' کا لفظ آیا ہے جو 'ایّم' کی جمع ہے۔ یہ غیر شادی شدہ مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں وہ عورتیں بھی آتی ہیں جن کی ابھی ازدواجی زندگی ہی نہیں شروع ہوئی ہے، اور وہ عورتیں بھی اس میں شامل ہیں جن کی ازدواجی زندگی طلاق یا بیوگی کی وجہ سے ختم ہوگئی ہے۔ اس میں شک نہیں مختلف اسباب کی بنا پر موجودہ دور میں بیوہ اور مطلقہ کے دوبارہ نکاح کا رجحان مسلمانوں میں کم ہوتا جارہا ہے، لیکن اسلام اس رجحان کو بڑھاتا ہے اور اسے فی الواقع بڑھنا ہی چاہیے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی کے مزاج میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ الگ ہوگئے ہیں یا ان میں سے ایک کی موت نے دوسرے کی ازدواجی زندگی کو ختم کر دیا ہے تو اس کا فوراً نکاح ہو جانا چاہیے اس لیے کہ بغیر نکاح کے رہنا بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ اگر اس تعلیم پر عمل ہو تو مطلقہ یا بیوہ کا معاشی مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس کے بعد اس کی معاشی ذمہ داری قانونی طور پر شوہر اٹھانے لگتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں جب تک اس پر عمل تھا بیوہ اور مطلقہ کا کوئی مسئلہ ہی عملاً موجود نہ تھا۔ یہ اس مسئلہ کا بہترین حل ہے جسے عام ہونا چاہیے۔

۴۔ مطلقہ اسی طرح بیوہ کے پاس کوئی معقول ذریعہ معاش نہ ہو اور اس کا نکاح ثانی

بھی نہ ہو تو اسلام نے اس کے خاندان پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ڈالی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلامی قانون کی رو سے عورت کبھی اس بات پر مجبور نہیں ہوئی کہ وہ اپنی معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرے[1] فقہ میں کہا گیا ہے 'مجرد الانوثة عجز'[2] (محض عورت ہونا ایک عجز ہے) یعنی اس کے اندر اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنا معاشی بوجھ اٹھا سکے۔ اسی وجہ سے دوسروں کو اس کی یہ ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے۔ شوہر ہر حال میں اس کا نفقہ برداشت کرتا ہے۔ طلاق کے بعد اگر وہ خود کفیل نہیں ہے اور اس کی اولاد کسب اور محنت کے قابل ہے تو اولاد پر اس کا نان و نفقہ واجب ہو جاتا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بات کی وضاحت کر دی جائے۔ وہ یہ کہ فقہا نے لکھا ہے کہ والدین کے نفقہ میں وہ تمام سہولتیں شامل ہیں جو بیوی کے نفقہ میں آتی ہیں۔

ان جمیع ما وجب للمرأة	بیوی کے نفقہ میں جو چیزیں واجب ہیں وہ ساری
وجب للاب والام علی الولد	چیزیں ماں باپ کے نفقہ میں لڑکے پر واجب ہوں
من طعام وشراب وکسوة	گی یعنی کھانا، پینا، لباس، مکان، یہاں تک کہ
وسکنی حتی الخادم[3]	خادم بھی اس میں آتا ہے۔

طلاق کے بعد اگر اس کی دوسری شادی نہ ہو اور اس کے بچے بھی اس کا بوجھ نہ اٹھا سکتے ہوں تو اس کے باپ پر اس کا نفقہ بالکل اسی طرح لازم آجائے گا جس طرح شادی سے پہلے اس پر لازم تھا۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے شارح علامہ ابن الہمام لکھتے ہیں۔

فالاناث علیه نفقتهن الی	باپ پر لڑکیوں کا نفقہ اگر ان کے پاس مال
ان یتزوجن اذا لم یکن لهن	نہیں ہے تو ان کی شادی تک واجب ہے۔
مال ولیس له ان یواجرهن	وہ انھیں کسی کام یا خدمت پر نہیں لگا سکتا

---

[1] اس کی تھوڑی سی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'عورت اور اسلام'، ص ۲۹-۳۰

[2] رد المحتار علی الدر المختار: ۹۲۵/۲ [3] رد المحتار علی الدر المختار: ۲/ ۹۳۳

فی عمل ولا خدمۃ وان کان	چاہے وہ یہ کرہی کیوں نہ سکتی ہوں[1] اگر
لھن قد رۃ واذا اطلقت و	اس کی طلاق ہوجائے تو عدت پوری ہونے
انقضت عدتھا عادت نفقتھا	کے بعد اس کا نفقہ دوبارہ باپ پر واجب
علی الاب[2]	ہوجائے گا۔

باپ نہ ہو تو جو بھی اس کا قریبی محرم ہوگا جیسے چچا، بھائی، وغیرہ وہ اس کی معاش کا ذمہ دار ہوگا۔ ان میں سے بھی کوئی موجود نہ ہو یا اس کا معاشی بوجھ نہ اٹھا سکے تو اسلامی ریاست اس کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ جہاں اسلامی ریاست نہ ہو وہاں مسلم معاشرہ کو یہ بوجھ اٹھانا چاہیے۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ اس طرح کی عورتوں کا مسئلہ حل کرنا چاہے تو حل کرسکتا ہے[3]

جو لوگ اس مسئلہ میں اعتراض پر اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے قانون نفقات سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہاں صرف اس کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات جاننے کی انھیں کوشش کرنی چاہیے۔

---

[1] عورت کیا کام کرسکتی ہے اور کن حدود میں، اس پر ہم نے اپنی کتاب 'عورت اسلامی معاشرہ میں' میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ [2] فتح القدیر: ۳۴۴/۳

[3] یہ بات اسلامی نقطۂ نظر سے کہی گئی ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان ایک فلاحی ریاست ہے۔ یہ خود اس کی بھی ایک بنیادی ذمہ داری ہے کہ جو افراد معاشی لحاظ سے بے سہارا ہوں ان کو سہارا دے اور ان کا معاشی بوجھ اٹھائے۔

خلع کی نوعیت

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ جس طرح طلاق کا حق مرد کو حاصل ہے اسی طرح کا حق عورت کو بھی حاصل ہو۔ وہ مرد سے علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے اور جب چاہے اس سے الگ ہو سکے۔ ان کے نزدیک اسلام نے اس معاملہ میں کوئی ناانصافی نہیں کی ہے۔ مرد کو طلاق کا حق دیا ہے تو یہی حق خلع کی شکل میں عورت کو عطا کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عورت اگر شوہر کو مہر واپس کر کے اپنے گھر بیٹھ جائے تو خلع ہو جائے گا۔ گویا خلع عورت کی طرف سے عقدِ نکاح ختم کرنے کا اعلان ہے۔ چاہے مرد اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔ یہ خلع کی نوعیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہاں ہم اس کی فقہی نوعیت واضح کرنا چاہتے ہیں[1]

خلع مرد کا حق ہے

شرعی نقطۂ نظر سے نکاح کے ذریعہ عورت مرد کے 'ملکِ نکاح' میں آتی ہے۔ اس ملکیت کو مرد ہی ختم کر سکتا ہے، عورت ختم نہیں کر سکتی۔ خلع کا مطلب صرف یہ ہے کہ عورت سے مال لے کر مرد اس ملکیت سے دست بردار ہو جائے۔ چنانچہ عربی کے مشہور لغت قاموس میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ازالة ملك النكاح ببدل	معاوضہ لے کر ملکِ نکاح کا زائل کرنا۔
منها او من غيرها[2]	چاہے یہ معاوضہ وہ خود دے یا کوئی دوسرا دے۔

---

[1] خلع کے احکام و مسائل کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "خلع اور اس کے احکام" مطبوعہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ علی گڑھ ج ۱۲ شمارہ ۲ اپریل جون ۱۹۹۳ء [2] فیروز آبادی: القاموس المحیط۔ مادہ

اب فقہاء کی تشریحات ملاحظہ ہوں۔ علامہ اکمل الدین بابرتی نے اس کی لغوی تعریف کے بعد اس کی شرعی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

وفی الشریعۃ عبارۃ عن اخذ مال من المرأۃ بازاء ملک النکاح بلفظ الخلع[1]	شریعت میں خلع کا مطلب ہے ملکِ نکاح کے مقابلہ میں عورت سے مال لینا خلع کا لفظ استعمال کرکے۔

علامہ ابن ہمام کہتے ہیں۔

ازالۃ ملک النکاح ببدل بلفظ الخلع[2]	کوئی بدل لے کر ملک نکاح کو خلع کا لفظ استعمال کرکے ختم کردینا۔

لفظ خلع کے استعمال کے بارے میں کہا گیا ہے۔

مطلق لفظ الخلع محمول علی الطلاق بالعوض[3]	لفظ خلع کا مطلق استعمال ہو تو اسے طلاق بالعوض پر محمول کیا جائے گا۔

یہ فقہ حنفی کی تشریحات ہیں۔ فقہ مالکی میں بھی خلع کو 'الطلاق بالعوض' سے تعبیر کیا گیا ہے[4] یعنی معاوضہ یا بدل لے کر طلاق دینا۔

قاضی بیضاوی شافعی کہتے ہیں۔

الاظہرانہ طلاق لانہ فرقۃ باختیار الزوج فہو کالطلاق بالعوض[5]	بظاہر یہ طلاق ہے۔ اس لیے کہ اس میں شوہر کی مرضی سے جدائی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ طلاق بالعوض ہے۔

---

[1] العنایہ علی الہدایہ علی ہامش فتح القدیر ۳/ ۱۹۹

[2] فتح القدیر: ۳/ ۱۹۹ اس تعریف پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ 'بدل' کا لفظ اس میں صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ بدل کے ذکر کے بغیر بھی مرد اگر عورت سے کہے کہ میں نے تم سے خلع کیا اور عورت اسے قبول کرلے تو خلع ہوجائے گا۔ ہاں اگر مہر کو 'بدل' کہا جائے جو خلع کی وجہ سے ساقط ہوجاتا ہے تو بات دوسری ہے۔ در المختار مع رد المحتار ۲/ ۷۷۰، ۷۷۴ لیکن شرح وقایہ میں اسے بدل ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ویلزمہ بدلہ، ۲/ ۱۲۲ یعنی عورت پر خلع کا بدل لازم ہے (چاہے وہ مہر ہو یا اس سے کم یا زیادہ قیمت کی کوئی چیز) یہ ایک قانونی بحث ہے۔ اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ خلع کے ذریعہ عورت خود بخود نکاح سے آزاد نہیں ہوجاتی۔ [3] رد المحتار علی الدر المختار ۲/ ۷۷۶ [4] احمد الدردیر: الشرح الصغیر علی اقرب المسالک ۲/ ۵۱۹

[5] انوار التنزیل واسرار التاویل تفسیر سورۂ بقرہ ص ۱۱۱

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خلع طلاق ہی کی ایک شکل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے طلاق کا حق صرف مرد کو دیا ہے۔ وہی خلع بھی کر سکتا ہے اور طلاق بھی دے سکتا ہے۔

خلع کو عورت کے استحصال کے لئے استعمال کی اجازت نہیں ہے

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مرد خلع کے اس حق کو عورت کے استحصال کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ وہ عورت کو الگ کرنا چاہے تو اسے طلاق نہیں دے گا تاکہ اسے مہر نہ دینا پڑے بلکہ عورت کو اس قدر تنگ کرے گا کہ وہ اپنا مال دے کر اس سے جان چھڑانے پر مجبور ہو جائے۔ لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ شریعت کا اصول ہے کہ کوئی بھی شخص ناحق یا زبردستی کسی کا مال اس سے لے نہیں سکتا۔ عورت کا مال بھی اس کی ملکیت ہے۔ وہ خوشی سے اپنا مال شوہر کو دے تو یہ اس کے لیے جائز مال ہوگا اور خلع کے نام پر یا کسی اور نام پر اس کی مرضی کے بغیر زور زبردستی سے جو مال وہ اس سے حاصل کرے گا وہ ناجائز ہوگا۔ علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

ان اخذ الزوج من امرأته	شوہر کا اپنی بیوی سے زبردستی یا تکلیف
مالا علی وجه الاکراه لها	پہونچانے کے لیے مال لینا تاکہ وہ اپنا کچھ مال
والاضرار بها حتی تعطیه	دے کر اس سے علیحدگی حاصل کرلے حرام
شیئا من مالها علی فراقها	ہے چاہے وہ جو کے ایک دانہ کے برابر چاندی
حرام ولو کان ذٰلک حبة فضة	ہو یا اس سے بڑی رقم۔
فصاعدا[1]	

بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر مرد خلع کے لیے غلط طریقے سے عورت سے رقم لینے کی کوشش کرے تو اپنی طاقت کی حد تک اسے بچنا چاہیے۔ ورنہ وہ گناہ گار ہوگی[2]

علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں:-

لا یجوز للرجل ان یاخذ منها	مرد کے لیے عورت سے کوئی چیز لینا اسی وقت

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری ۲/۵۶۱-۵۶۲

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر طبری ۲/۵۶۶-۵۶۷

شیئا الا برضاها من غیر ایذاء منه ولا مضارة [1]	جائز ہے جب کہ وہ خوشی سے دے اور اس کے لیے اس نے اسے کوئی تکلیف یا نقصان نہ پہونچایا ہو۔

اب اس مسئلہ میں فقہاء کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ مرد اگر عورت کو خلع پر مجبور کرے تو طلاق تو ہو جائے گی لیکن مال اسے نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ مال کا لین دین باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔ جبر سے نہیں ہوتا۔ چنانچہ درمختار میں ہے۔

اکرهها الزوج علیه تطلق بلا مال لان الرضا شرط للزوم المال وسقوطه [2]	شوہر اگر عورت کو خلع پر مجبور کرے تو مال کے بغیر طلاق ہو جائے گی۔ عورت پر مال کے واجب ہونے یا اس کے مہر کے ساقط ہونے کے لیے اس کی رضامندی شرط ہے۔

یہی بات فقہ مالکی میں بھی کہی گئی ہے کہ اگر عورت خلع حاصل کرنے کے بعد یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اس وجہ سے خلع حاصل کیا تھا کہ وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور اسے ایسی تکلیف پہونچ رہی تھی جس میں طلاق کا جواز پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اپنا مال واپس لے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اپنے اس دعویٰ پر شہادت فراہم کر دے۔ شہادت کے لیے لوگوں کا یہ کہنا کافی ہے کہ وہ مستقل یہ سنتے تھے کہ وہ اسے پریشان کرتا ہے۔ اگر عینی شہادت ہو تو دو مرد گواہ ہوں یا عورت قسم کھائے اور ایک مرد یا دو عورتیں گواہی دیں۔ عینی شہادت کے لیے ایک مرتبہ کا مشاہدہ بھی کافی ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر مرد اس شرط پر خلع کرے کہ عورت کو جو تکلیف وہ دے رہا تھا اس کا ثبوت نہیں دے گی تب بھی وہ خلع کے بعد اس کا ثبوت فراہم کر سکتی ہے۔ بہر حال خلع میں طلاق بائن ہو گی۔[3]

امام شافعی اور امام احمد وغیرہ اس خلع ہی کو باطل کہتے ہیں۔ علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے

---

[1] تفسیر المنار ۲/۳۸۹ [2] درالمختار مع ردالمحتار ۲/۷۲۲ [3] الشرح الصغیر ۲/۵۳۰

ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو خلع پر مجبور کرنے کے لیے تنگ کرے، مار پیٹ کرے، نفقہ اور شب باشی وغیرہ کے حقوق نہ ادا کرے اور عورت مجبور ہو کر خلع حاصل کر لے تو خلع باطل ہو گا اور شوہر کو معاوضہ واپس کرنا ہو گا۔ یہی امام شافعی، اسحٰق بن راہویہ وغیرہ کا بھی مسلک ہے[1]۔

اسلام نے خلع کا طریقہ اس لیے رکھا ہے کہ اگر مرد کی طرف سے زیادتی ہو یا عورت اسے ناپسند کرتی ہو تو وہ اسے معاوضہ دے کر قید نکاح سے آزادی حاصل کر سکے۔ خلع اس لیے نہیں ہے کہ مرد عورت کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے، جہاں ایسی صورت ہو وہ قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہے۔ اسلامی قانون اس کی مدد کرے گا۔

خلع کا حق حکومت کو نہیں دیا جا سکتا

ایک رائے یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ خلع کا حق حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ خلع کے معقول اسباب ہوں تو خلع کرا دے اور ان اسباب سے مطمئن نہ ہو تو خلع نہ کرائے۔ سلف میں بھی یہ رائے پائی جاتی تھی۔ چنانچہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں "لا یجوز الخلع دون السلطان" مطلب یہ کہ خلع حاکم وقت ہی کرا سکتا ہے۔ اس کے بغیر یہ جائز نہیں ہے۔ محمد بن سیرینؒ نے بھی اسے سلف سے نقل کیا ہے۔ بعد میں ابو عبید نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے فرمایا:

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ (بقرہ: ۲۲۹)	اگر تمہیں ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کے حدود کو قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس مال (کے لینے دینے) میں کوئی حرج نہیں جسے دے کر عورت خود کو چھڑائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

---

[1] مغنی، [illegible]

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا — اگر تمہیں ان کے درمیان اختلاف کا ڈر ہو تو
فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ — تم شوہر کے لوگوں میں سے ایک حکم اور
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (النساء: ۳۵) — عورت کے لوگوں میں سے ایک حکم بھیجو۔

اس میں بظاہر خطاب میاں بیوی سے نہیں ہے بلکہ امراء و حکام سے ہے کہ وہ جب میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا یا حدود اللہ کو قائم نہ رکھنے کا اندیشہ محسوس کریں تو صلح صفائی یا خلع کا اقدام کریں[1]۔

لیکن جمہور کے نزدیک خلع کے لیے حکومت کے فیصلہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قاضی شریح، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور احناف کی یہی رائے ہے۔ حسن بصریؒ وغیرہ کی رائے کے خلاف حسب ذیل دلائل دیے گئے ہیں۔

۱۔ یہ ایک شاذ رائے ہے۔ بہت بڑی اکثریت اس کے خلاف ہے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ یہ رائے حضرت حسن بصریؒ نے حضرت معاویہ کے گورنر عراق زیاد سے لی ہے۔ حافظ ابن حجر کے بقول زیاد کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کی تقلید کی جائے۔

۲۔ اس رائے کا مطلب یہ ہے کہ خلع اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف پایا جائے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے اس لیے کہ خلع صرف عورت کے شوہر کو ناپسند کرنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی انھیں سخت ناپسند کرتی تھیں، اور اسی ناپسندیدگی کی وجہ سے ان سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ ثابت بن قیسؓ نے مہر میں جو باغ دیا ہے اسے وہ انھیں واپس کر دیں اور ثابت بن قیس سے کہا کہ وہ اپنا باغ لے کر انھیں طلاق دے دیں۔ آپ نے ان سے یہ نہیں دریافت فرمایا کہ انھیں بھی بیوی سے کوئی اختلاف ہے یا نہیں[2]۔

---

[1] فتح الباری: ۹/۳۱۹

[2] اس واقعہ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بخاری، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابواب الطلاق

۳۔ طلاق کی طرح خلع بھی مرد کا حق ہے۔ جس طرح حاکم کی اجازت کے بغیر مرد طلاق دے سکتا ہے اسی طرح خلع بھی کر سکتا ہے۔ جو حق اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے اسے اس سے چھین کر کسی دوسرے ادارے کو دینا صحیح نہیں ہے[1]۔

۴۔ خلع میں مرد عورت سے معاوضہ لیتا ہے۔ معاوضہ اور بیع میں حاکم کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی[2]۔

جمہور کے مسلک کی تائید حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں۔ اجاز عمر الخلع دون السلطان[3] حضرت عمرؓ نے حاکم کے بغیر بھی خلع کو جائز قرار دیا۔

اس کی تفصیل عبداللہ بن شہاب خولانی کی روایت میں ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے دور میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے خلع کیا تو حضرت عمرؓ نے اسے جائز قرار دیا[4]۔

ربیع بنت معوذ اور ان کے چچا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں پہونچے۔ ربیع نے ان سے کہا کہ حضرت عثمانؓ کے دور میں انھوں نے اپنے شوہر سے خلع حاصل کیا۔ حضرت عثمانؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ابھی اسے غلط نہیں قرار دیا۔ اور فرمایا کہ مختلعہ کی عدت وہی ہے جو مطلقہ کی ہے[5]۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے دور میں اپنی بیوی سے خلع کیا تو انھوں نے اسے جائز قرار دیا[6]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلع عورت اور مرد کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اس میں حکومت کا دخل دینا یا اسے دخیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

---

[1] فتح الباری ۳۱۹/۹   [2] المغنی : ۵۲/۷   [3] بخاری، کتاب الطلاق، باب الخلع

[4] فتح الباری ۳۱۹/۹   [5] موطا، ابواب الطلاق، طلاق المختلعہ   [6] بیہقی : السنن الکبری ۳۱۶/۷

عورت کا حقِ وراثت

اسلام سے قبل عرب کے معاشرہ میں عورت کا وراثت میں کوئی حق نہیں تھا۔ دلیل یہ تھی کہ عورت کمزور ہے، نہ معاشی دوڑ دھوپ کرسکتی ہے، نہ اپنا اور خاندان کا دفاع اس کے بس میں ہے اور نہ مالِ غنیمت اس کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے لہٰذا خاندان کی دولت کی وارث وہ نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کم سن لڑکے بھی وراثت سے محروم رکھے جاتے تھے۔ صرف بالغ مرد جو دشمن کا مقابلہ کرسکیں وراثت میں حصہ پاتے تھے۔[1]

وراثت میں مرد اور عورت دونوں کا حق ہے

عرب کا معاشرہ ہی نہیں دنیا کے سب ہی معاشروں نے اسی قسم کے دلائل کی بنیاد پر عورت کو وراثت سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ نرینہ اولاد کا اور اس میں بھی بڑی اولاد کا حق سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور اعلان کیا کہ وراثت میں جس طرح مردوں کا حق ہے اسی طرح عورتوں کا بھی حق ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ	مردوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں
الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ	باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ	عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں
وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ	باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے چاہے

---

[1] تفسیر ابن جریر: ۴/۱۶۲، ۱۶۴۔ اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "اسلام کا قانونِ وراثت" مجموعہ "برہان" دہلی فروری ۱۹۶۷ء

نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا (النساء: ۷) وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

اس اصولی ہدایت کے ساتھ قرآن مجید نے وراثت میں عورت اور مرد کے حقوق بھی متعین کر دیئے ہیں۔ بعض تفصیلات حدیث اور فقہ میں ملتی ہیں۔ اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں عورت اور مرد کے ساتھ مساوات نہیں برتی گئی ہے اور مرد کا حق عورت کے حق سے زیادہ رکھا گیا ہے لیکن یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے جو اسلام کے قانون وراثت اور اس کی حکمت اور معنویت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک اس قانون کی تفصیلات اور اس کی حکمتیں سامنے نہ ہوں اسے پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا، بلکہ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہاں پہلے ہم قانونِ وراثت کی تھوڑی سی تفصیل پیش کریں گے اس کے بعد اس کی حکمت واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

لڑکے اور لڑکی کا حق

اسلام نے وراثت کو خاندان میں محدود رکھا ہے اور افرادِ خاندان کے درجہ بدرجہ حقوق متعین کر دیئے ہیں اس میں پہلا اور سب سے بڑا حق اولاد کا ہے۔ ارشاد فرمایا:۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوۡلَادِكُمۡ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ (النساء: ۱۱)	اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے حق میں ہدایت کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے[1]

اس سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ وراثت صرف لڑکوں کا حق نہیں

---

[1] فرمایا دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ایک لڑکے کا حصہ ہے یہ نہیں فرمایا کہ ایک لڑکے کے حصہ کے برابر دو لڑکیوں کا حصہ ہے گویا اصلاً لڑکیوں کا حصہ ہے اس کے ذریعہ جاہلیت کے اس تصور کی تردید کی گئی ہے کہ لڑکیاں وراثت کی حقدار نہیں ہیں۔ اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ اصل حقدار وہی ہیں البتہ لڑکوں کو بعض وجوہ سے ان سے زیادہ دیا جائے گا یہی تعبیر وراثت کے اور احکام کے سلسلے میں بھی اختیار کی گئی ہے۔ تفسیر المنار: ۴/۴۰۵

ہے اس میں لڑکیوں کا بھی حصہ ہے۔

۲۔ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ فرض کیجئے میت کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے تو وراثت تین حصوں میں تقسیم ہوگی۔ ایک حصہ (⅓) لڑکی کو اور دو حصے (⅔) لڑکے کو ملیں گے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہو تو وراثت کے چار حصے ہوں گے۔ دو حصے (½) یعنی نصف دو لڑکیوں کو ملیں گے اور دو حصے لڑکے کو۔

ارشاد فرمایا:-

فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ (النساء: ۱۱)

اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لیے میت کے ترکہ کا دو ثلث ہے۔

یہ اس صورت حال کا ذکر ہے جب کہ نرینہ اولاد نہ ہو اور دو سے زائد لڑکیاں موجود ہوں اس صورت میں انھیں دو ثلث (⅔) ملے گا۔ اس میں دو سے زیادہ لڑکیوں کی وراثت کا ذکر ہے لیکن یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے[1]

---

[1] اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ ایک لڑکے کے ساتھ ایک لڑکی ہو تو اسے، جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، ایک ثلث (⅓) ملتا ہے۔ جب ایک لڑکی دوسری لڑکی کے ساتھ ہو تو فطری بات ہے اس کا حصہ اس سے کم نہیں ہونا چاہیے۔

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید نے صراحت کی ہے کہ میت کے اولاد یا بھائی نہ ہوں اور دو بہنیں ہوں تو وہ دو ثلث (⅔) کی حقدار ہوں گی (النساء: ۱۷۶) جب دو بہنیں دو ثلث کی حقدار ہیں تو دو لڑکیاں بدرجہ اولیٰ اس کی حقدار ہوں گی۔

تیسری دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن ربیعؓ کی دو لڑکیاں تھیں۔ جنگ احد میں ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی نے ان کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اور ان لڑکیوں کو محروم کر دیا۔ آپ نے ان سے دو لڑکیوں کو دو ثلث (⅔) دلوایا (ترمذی، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث البنات۔ ابوداؤد، کتاب الفرائض باب ماجاء فی میراث الصلب)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب دو لڑکیوں کا حصہ دو ثلث ہے تو قرآن مجید نے 'فوق اثنتین' دو سے زیادہ کے الفاظ کیوں استعمال کئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دو لڑکیوں کو اوپر کے قاعدہ کے تحت جب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اگر میت کی اولاد نہیں ہے اور صرف ایک لڑکی ہے تو وہ نصف ورثہ کی حقدار ہوگی۔ فرمایا:

وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ — اور اگر لڑکی ایک ہے تو اسے ترکہ کا نصف ہے۔

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ صرف ایک لڑکا ہو تو وہ پورے مال کا وارث ہوگا اس لیے کہ لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوگنا ہے۔ جب تنہا ایک لڑکی نصف کی مستحق ہے تو تنہا ایک لڑکے کو کل کا مستحق ہونا ہی چاہیئے البتہ ایک سے زائد لڑکے ہوں تو وراثت ان کے درمیان مساوی طور پر تقسیم ہوگی۔ اس لیے کہ ایک بھائی اور دوسرے بھائی کے درمیان فرق کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

ماں اور باپ کا حق

اولاد کے بعد وراثت میں ماں باپ کا حق ہے۔ قرآن مجید نے ان کے حق وراثت کو اس طرح بیان کیا ہے:

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا	اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک
السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ	کا چھٹا حصہ ہے اس کے ترکہ میں سے اگر
لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ	میت کے اولاد ہے۔ اگر اولاد نہیں ہے
وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ	اور اس کے ماں باپ وارث ہو رہے ہیں
فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ	تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی ہے۔ اگر
السُّدُسُ	اس کے بھائی بہنیں ہیں تو اس کی ماں کا حصہ
(النساء: ۱۱)	چھٹا ہوگا۔

اس سے حسب ذیل اصول نکلتے ہیں:

۱۔ میت صاحب اولاد ہے، چاہے ایک ہی لڑکا یا لڑکی کیوں نہ ہو، تو ماں باپ

(بقیہ گزشتہ حاشیہ)
ایک ایک ثلث ملے گا تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ دو سے زیادہ لڑکیوں کو دو ثلث سے زیادہ ملنا چاہیئے۔ قرآن مجید نے اس کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو بھی انھیں دو ثلث ہی ملے گا۔

میں سے ہر ایک کو سدس (⅙) ملے گا۔ اولاد ہی کے حکم میں پوتا پوتی اور ان سے نیچے کی اولاد بھی۔

۲۔ میت کے کوئی اولاد نہیں ہے تو ماں کا حصہ ایک ثلث (⅓) ہوگا اور باقی دو ثلث (⅔) کا وارث باپ ہوگا۔

۳۔ میت کے اولاد تو نہیں ہے لیکن دو یا دو سے زیادہ بھائی بہنیں (کسی بھی قسم کے) ہیں تو پھر ماں کا حصہ سدس (⅙) ہو جائے گا۔ باقی سارا مال باپ کو ملے گا۔ بھائی اور بہنوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

اولاد اور والدین کے حقوق بیان کرنے کے بعد فرمایا:

مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ	اس پر عمل اس وصیت کی تعمیل کے بعد
بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ	ہوگا جو مرنے والے نے کی ہے یا قرض
لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا ؕ	کی ادائیگی کے بعد۔ تمہارے باپ اور تمہارے
فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہارے
عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۞	لیے زیادہ نافع ہے۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ
(النساء: ۱۱)	ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے وصیت کی تعمیل ہوگی اور قرض ادا کیا جائے گا۔ اس کے بعد وراثت وارثوں میں تقسیم ہوگی[1]

---

[1] میت کے ترکہ میں حسب ذیل چار حقوق ہیں:

۱۔ میت کی تجہیز و تکفین کا اوسط درجہ کا انتظام۔

۲۔ قرض ہو تو اس کی ادائیگی۔

۳۔ وصیت ہو تو اس کی تعمیل۔

۴۔ باقی ترکہ وارثوں کے درمیان قانون شریعت کے مطابق تقسیم ہوگا۔

آیت میں قرض کا ذکر وصیت کے بعد ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے وصیت پوری کی جائے گی

میاں اور بیوی کا حق

وراثت میں میاں بیوی کے حقوق قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ	تمہارا حصہ نصف ہے تمہاری بیویوں کے
إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ فَإِنْ	ترکہ میں اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اگر ان کے
كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا	اولاد ہے تو تمہارا حصہ ربع ہوگا ان کے ترکہ
تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ	میں۔ اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد جو
بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ	انھوں نے کی ہے یا (ان کے چھوڑے ہوئے)
مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ	قرض کے ادا کرنے کے بعد — عورتوں کا
لَكُمْ وَلَدٌ فَإِنْ كَانَ	حصہ ربع ہے تمہارے ترکہ میں اگر تمہارے
لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا	اولاد نہیں ہے۔ اگر تمہارے اولاد ہے
تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ	تو ان کو تمہارے ترکہ میں سے ثمن ملے گا جو وصیت
تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ	تم نے کی ہے اس کی تعمیل اور قرض کے ادا
(النساء: ۱۲)	کرنے کے بعد۔

(بقیہ گذشتہ حاشیہ) اسے پورا کرنے کے بعد وراثت تقسیم کی جائے گی۔ قرض دوسرے کا حق ہے جو آدمی پر عائد ہوتا ہے۔ زندگی میں جس طرح اس کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری تھا اسی طرح مرنے کے بعد اس کے مال میں سے اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ وصیت کرنا اس کے لیے فرض نہیں ہے یہ ایک نفلی عمل ہے۔ ظاہر ہے فرض نفل پر مقدم ہوگا۔ آیت میں وصیت کا ذکر پہلے اس لیے کیا گیا ہے تاکہ اسے مرنے والے کا نفلی عمل سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔ جب میت نے وصیت کی ہے تو اس کی تعمیل ضروری ہے۔ حضرت علیؓ کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قرض کو وصیت پر مقدم رکھا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) وصیت کے بارے میں حدیث میں یہ بھی صراحت ہے کہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے سارے مال کی وصیت کرنی چاہی تو آپ نے فرمایا الثلث والثلث كثير (بخاری، مسلم) یعنی تم ایک ثلث (۱/۳) وصیت کر سکتے ہو اور ایک ثلث بھی زیادہ ہے۔

اس آیت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ شوہر کو بیوی کے ترکہ سے نصف (½) ملے گا اگر بیوی کے کوئی اولاد (اسی شوہر سے یا سابق شوہر سے) نہ ہو۔ اس پر اجماع ہے کہ اولاد میں پوتا بھی آتا ہے:

۲۔ شوہر کو بیوی کے ترکہ سے ربع (¼) ملے گا اگر اس کی کوئی اولاد موجود ہو (چاہے اس شوہر سے ہو یا کسی سابق شوہر سے)

۳۔ بیوی کو شوہر کے ترکہ سے ربع (¼) ملے گا اگر شوہر کے کوئی اولاد نہ ہو۔

۴۔ بیوی کو ثمن (⅛) ملے گا اگر شوہر کے کوئی اولاد ہو۔ (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اولاد اسی بیوی سے ہے یا کسی دوسری بیوی سے)

اخیافی بھائی بہن کا حق

اولاد، ماں باپ اور میاں بیوی ہر حال میں وارث ہوں گے۔ ان کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا حق ہے۔ اس میں سب سے پہلے میت کے بھائی بہن آتے ہیں۔ بھائی بہن تین طرح کے ہوتے ہیں۔ عینی، علاتی اور اخیافی[1] ان میں عینی (حقیقی) بھائی بہنوں کا حق سب سے مقدم ہے۔ وہ نہ ہوں تو علاتی بھائی بہن وارث ہوں گے۔ اخیافی بھائی بہنوں کے حصے متعین ہیں۔ ان کے یہ حصے امت کا اجماع ہے کہ اس آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً	اگر کسی ایسے مرد یا عورت کی میراث ہے جس
أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ	کا باپ یا بیٹا نہیں ہے اور اس کا ایک بھائی
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ	(اخیافی) یا ایک بہن (اخیافی) ہے تو ان میں
فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ	سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اگر وہ دو سے

---

[1] عینی: حقیقی بھائی بہن کو کہا جاتا ہے۔ جو ایک ماں باپ کی اولاد ہوں، علاتی: سوتیلے بھائی بہن کو کہا جاتا ہے جن کا باپ تو ایک ہو لیکن مائیں مختلف ہوں۔ اخیافی: ان بھائی بہنوں کو کہا جاتا ہے جن کی ماں تو ایک ہو لیکن باپ مختلف ہوں۔

شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ	زیادہ ہوں تو سب ایک ثلث (تہائی) میں
وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ	شریک ہوں گے۔ جو وصیت کی گئی ہے اسا
مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ	کے پورا کرنے اور قرض کے ادا کرنے کے
عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝	بعد کسی کو ضرر پہنچائے بغیر۔ یہ وصیت ہے
(النساء: ۱۲)	اللہ کی اور اللہ جاننے والا اور بردبار ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اخیافی بھائی ہو یا بہن ان میں سے ہر ایک سدس (⅙) کا حقدار ہوگا۔ اگر وہ دو سے زیادہ ہوں تو ایک ثلث (⅓) میں سب کے سب برابر کے شریک ہوں گے۔ اس میں بھائی اور بہن کے حصے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

عینی اور علاتی بھائی بہن کا حق

عینی اور علاتی بھائی اور بہنوں کے حقوق ان الفاظ میں بیان ہوئے ہیں:

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ	اگر کوئی شخص انتقال کر جائے اس کے کوئی
وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ	اولاد نہ ہو (باپ بھی نہ ہو) اس کے ایک بہن
وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ	ہو تو اس کا حصہ میت کے ترکہ میں سے نصف
فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ	ہوگا۔ اور وہ شخص اپنی بہن کا وارث ہوگا اگر بہن
مِمَّا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً	کے کوئی اولاد نہ ہو۔ اگر بہنیں دو ہوں تو ان کا
رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ	حصہ بھائی کے ترکہ میں سے دو ثلث ہوگا اور
حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللّٰهُ	اگر کئی بھائی اور بہنیں ہوں تو بھائی کا حصہ دو
لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ	بہنوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں
شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝	یہ باتیں کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم گمراہی میں
(النساء: ۱۷۶)	نہ پڑو۔ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے لڑکا (یا پوتا اور اس کے نیچے نرینہ اولاد) ہو۔ یا اوپر کے سلسلہ میں باپ، دادا وغیرہ ہوں تو بہنوں اور بھائیوں کا وراثت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اگر وہ

نہ ہوں تو ان کے درمیان وراثت حسب ذیل طریقہ سے تقسیم ہوگی۔

۱۔ صرف ایک بہن ہو تو اس کا حصہ نصف (½) ہوگا۔

۲۔ صرف ایک بھائی ہو تو وہ بہن کی پوری وراثت کا حقدار ہوگا۔

۳۔ دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں اور بھائی نہ ہو تو انھیں دو ثلث (⅔) ملے گا۔

۴۔ اگر بھائی اور بہن دونوں موجود ہوں تو ایک بھائی کا حصہ دو بہنوں کے برابر ہوگا۔

اگر میت کے صرف لڑکیاں ہیں تو ان کا متعین حصہ (ایک ہو تو نصف (½) اور ایک سے زیادہ ہو تو دو ثلث (⅔) دینے کے بعد جو مال بچے گا وہ بھائیوں اور بہنوں کے درمیان اوپر کے قاعدہ (ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر) کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اگر لڑکیوں کے ساتھ صرف بہنیں ہوں تو لڑکیوں کا حصہ دینے کے بعد جو بچ جائے وہ بہنوں کا ہوگا۔

یہ وراثت کے وہ موٹے موٹے احکام ہیں جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیلات حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

وراثت کی بنیادیں

نسبی رشتے اور ازدواجی تعلق اصل ہیں

اسلام کا یہ قانون وراثت جن بنیادوں پر قائم ہے اب ہم ان کی تھوڑی سی وضاحت کریں گے اس سے اس کی حکمت کے بعض گوشے سامنے آسکیں گے۔ وراثت کی ساری تقسیم افراد خاندان کے مابین ہوتی ہے۔ اس میں نسبی رشتوں اور نکاح کو بنیاد بنایا گیا ہے[1] خاندان ایک مستقل اکائی ہے جس کے افراد کو نسبی رشتہ اور خونی تعلق باہم جوڑے رکھتا ہے۔ ان کے درمیان محبت ہمدردی اور تعاون کا فطری جذبہ موجود ہوتا ہے، وہ عملاً ایک دوسرے کے نفع و نقصان

[1] وراثت کی ایک بنیاد 'ولاء' بھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ الولاء لمن اعتق (بخاری، کتاب البیوع، باب الشریٰ والبیع مع النساء۔ مسلم کتاب العتق، باب ان الولاء لمن اعتق) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی غلام کو آزاد کرے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو آزاد کرنے والا اس کا وارث ہوگا یہاں اس کی تفصیل سے بحث نہیں ہے۔

میں شریک ہوتے ہیں، ان کی ترقی میں مدد دیتے اور مشکلات میں کام آتے ہیں۔ اسی وجہ سے خاندان سے انسان کی وابستگی بڑی گہری ہوتی ہے۔ وہ اس کی فلاح و بہبود کو دوسرے بہت سے فائدوں پر مقدم رکھتا ہے، اس کی معاشی تگ و دو بھی بڑی حد تک اسی کے لیے ہوتی ہے اس لیے فطری طور پر وہ خاندان کو اپنی دولت میں شریک اور اس کا جائز حقدار تصور کرتا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان بالعموم خونی رشتہ تو نہیں ہوتا لیکن ان کا تعلق اتنا قریبی ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے کاموں میں اس طرح شریک ہوتے ہیں کہ وہ خاندان ہی کے افراد شمار ہوتے ہیں۔ وراثت میں ان کے حق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وہ رشتہ دار جو کبھی محروم نہیں ہوتے

خاندان کے جن افراد کا میت سے براہ راست تعلق ہوتا ہے ان کو وراثت میں لازماً ان کا حصہ ملتا ہے۔ اور وہ کسی حال میں اس سے محروم نہیں ہوتے۔ چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں۔ اس میں حسب ذیل افراد آتے ہیں۔

(الف) میت کی اولاد (اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں)۔

(ب) میت کے ماں باپ۔

(ج) میاں اور بیوی میں سے جو بھی موجود ہو۔

ان میں سے 'اصحاب الفرائض' کو ان کے متعین حصے ملیں گے۔ باقی مال کے وارث عصبہ ہوں گے[1]

---

[1] علم وراثت میں 'اصحاب الفرائض' ان افراد کو کہا جاتا ہے جن کے وراثت میں حصے شریعت نے متعین کر دیئے ہیں۔ ان حصوں کے نکالنے کے بعد جو افراد باقی مال کے وارث ہوتے ہیں انھیں 'عصبہ' کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میت کے بیوی، ماں باپ، لڑکا اور لڑکی ہیں تو ان میں ماں باپ اور بیوی 'اصحاب الفرائض' ہیں اس لیے کہ ان کے حصے متعین ہیں۔ باقی مال کے وارث لڑکا اور لڑکی ہوں گے اس لیے وہ 'عصبہ' کہلائیں گے۔ لڑکے کے بغیر صرف لڑکی ہوتی تو اس کا شمار بھی اصحاب الفرائض میں ہوتا کیونکہ اس صورت میں اس کا حصہ (النصف) متعین ہے۔ اس صورت میں باپ عصبہ ہوگا اس لئے کہ وہ اپنے متعین حصہ (سدس) کے علاوہ باقی مال کا بھی وارث ہوگا۔

خاندان کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں ان کی ترجیح کا سبب بالکل واضح ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر بھی ان کو سب سے زیادہ قریب تصور کرتا ہے اور عملاً بھی وہی اس کے قریب ہوتے ہیں۔ زندگی بھر براہ راست اور بلا واسطہ ان ہی سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ جو دولت اور سرمایہ وہ محنت اور مشقت سے حاصل کرتا ہے اسے ان پر خرچ کرکے ایک طرح کی روحانی مسرت اور سکون محسوس کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی وہی اس کی دولت کے وارث ہوں اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا اس کی دولت پر قبضہ نہ کرے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن نے اسی کو قانونی شکل عطا کی ہے۔

اولاد کا حق سب سے زیادہ ہے

خاندان کے ان قریبی افراد میں بھی اس نے اولاد کے حق کو والدین کے حق پر مقدم رکھا ہے۔ اس میں ان کی ضروریات اور معاشی تقاضوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اولاد اپنے والدین کی جانشین ہوتی ہے۔ وہ ان کے بعد ان کی بہت سی ذمہ داریوں کو اٹھاتی اور ان کے چھوڑے ہوئے منصوبوں کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس کے ساتھ خود اس پر نئی نئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کی تکمیل کے لیے اسے نئے وسائل تلاش کرنے پڑتے ہیں اور حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر کرنی ہوتی ہے اس لیے اسے دولت اور سرمایہ کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی اس کے والدین کو نہیں ہوتی۔ خود والدین بھی فطری طور پر اپنی دولت اپنی اولاد ہی کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں اور کسی دوسرے کو ان پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ہاں اگر اولاد نہ ہو تو والدین کا حق مقدم ہوگا۔

عورت اور مرد کے درمیان فرق کہاں اور کیوں؟

میت سے عورت اور مرد کا تعلق رشتہ کے لحاظ سے برابر کا ہو تو ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا جیسے لڑکا اور لڑکی یا بھائی اور بہن۔ اس کے پیچھے عورت کی کم تری اور مرد کی برتری کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ تصور ہوتا تو ہر حال میں عورت کا حصہ کم ہوتا یا وہ بالکل محروم

کردی جاتی۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے وراثت کو معاشی ذمہ داریوں کے ساتھ جوڑا ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے مرد پر ساری معاشی ذمہ داریاں ہیں جب کہ عورت کو ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے مثال کے طور پر لڑکے اور لڑکی کو لیجئے۔ لڑکا اپنے بیوی بچوں کا خرچ برداشت کرتا ہے، ہو سکتا ہے اسے ماں باپ میں سے جو موجود ہو اس کے اخراجات اٹھانے پڑیں۔ ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں جن میں اسے نادار بھائی بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں کی بھی کفالت کرنی پڑے۔ اس طرح مسلسل اس کے پاس آنے والا سرمایہ خرچ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف لڑکی صاحب حیثیت ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ اپنے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے اپنی ایک ذات کے سوا کسی دوسرے کی معاشی ذمہ داری اس پر نہیں ہے۔ شادی کے بعد تو اس پر اپنی معاشی ذمہ داری بھی باقی نہیں رہتی۔ شوہر پر اس کا نان و نفقہ لازم آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی ذمہ داریوں کو سامنے رکھا جائے تو نہ لڑکے کے حصہ کو زیادہ کہا جا سکتا ہے اور نہ لڑکی کے حصہ کو کم۔ دونوں میں انتہائی عدل و توازن قائم کیا گیا ہے۔

اسی طرح شوہر کے مقابلہ میں بیوی کا حصہ نصف ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ معاشی ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔ اس کے علاوہ شوہر سے اسے مہر ملتا ہے۔ شادی اور دوسری تقریبات پر اسے جو زیورات یا تحفے تحائف دیے جاتے ہیں وہ سب اس کی ملکیت ہیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد بیوی کو اور بیوی کے انتقال کے بعد شوہر کو وراثت میں ان کا حصہ ملتا ہے۔ اب اگر بیوی کے انتقال کے بعد شوہر دوسری شادی کرے تو اسے اس نئی بیوی کا بھی مہر دینا ہوگا اور نفقہ بھی برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن شوہر کے انتقال کے بعد بیوی دوسرا نکاح کرے تو اسے دوبارہ مہر ملے گا اور اس کا نفقہ بھی دوسرے شوہر پر واجب ہوگا۔ ان وجوہ سے کیا یہ عین انصاف نہیں ہے کہ وراثت میں بیوی کا حصہ شوہر کے حصہ سے نصف ہو؟ کیا یہ شوہر کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی کہ اس کا حصہ بیوی کے حصہ کے برابر کر دیا جائے؟ یہی بات حافظ ابن کثیرؒ نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

جعل للذکر مثل حظ الانثیین　　اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کا حصہ دو عورتوں

وذلك لاحتياج الرجل الى مؤنة النفقة والكلفة ومعاناة التجارة والتكسب وتحمل المشاق فناسب ان يعطى ضعفي ما تاخذه الانثى[۱]

کے حصہ کے برابر رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد کو نان ونفقہ کا بوجھ اور تکلیف تجارت اور کسب معاش کی دشواریاں اور اس سلسلہ کی دوسری مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ عورت جو حصہ پاتی ہے اس سے دوگنا مرد کو دیا جائے۔

علامہ رشید رضا مصری کہتے ہیں۔

والحكمة فى جعل حظ الذكر كحظ الانثيين هى ان الذكر يحتاج الى الانفاق على نفسه وعلى زوجه فكان له سهمان واما الانثى فهى تنفق على نفسها فان تزوجت كانت نفقتها على زوجها وبهذا الاعتبار يكون نصيب الانثى من الارث اكثر من نصيب الذكر فى بعض الحالات بالنسبة الى نفقاتهما[۲]

ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ مرد کو اپنے اوپر بھی اور اپنی بیوی پر بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کے دو حصے ٹھہرے۔ عورت صرف اپنی ذات پر خرچ کرتی ہے۔ اگر شادی ہو جائے تو اس کا اپنا نفقہ بھی اس کے شوہر پر واجب ہو جاتا ہے۔ نان ونفقہ کی ذمہ داریوں ہی کے پہلو سے بعض حالات میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ سے زیادہ بھی ہو جاتا ہے۔

اس طرح اسلام نے عورت پر سے معاشی ذمہ داریوں کو ختم کر کے وراثت کی بعض صورتوں میں اس کا حصہ مرد کے حصہ سے نصف رکھا ہے۔ اس پر نہ تو مرد کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس پر ذمہ داریاں کیوں ڈالی گئی ہیں اور نہ عورت یہ شکایت کر سکتی ہے کہ اس کا حصہ

---

۱ تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۵۷ ۲ تفسیر المنار: ۴/۴۰۶۔ اس بیان میں یہ بات صحیح نہیں ہے کہ عورت کی معاشی ذمہ داریوں کی وجہ سے وراثت میں کبھی اس کا حصہ مرد کے حصہ سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ میت سے عورت کی قرابت ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

کم کیوں رکھا گیا ہے۔ اس کے برخلاف وراثت میں دونوں کا حصہ مساوی ہوتا تو مرد یہ مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہوتا کہ معاشی ذمہ داریوں میں بھی عورت کو شریک کیا جائے۔ حقوق اور ذمہ داریوں کی یہ تقسیم مرد اور عورت دونوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس سے بہتر تقسیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ابن قیم مرد کی مالی ذمہ داریوں کے ساتھ ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ آدمی کو اس کی زندگی میں عورت سے زیادہ مرد سے مادی فائدہ پہونچتا ہے لہٰذا اس کے مرنے کے بعد مرد کا حصہ بھی اس کے مال میں زیادہ ہونا چاہیے۔ فرماتے ہیں۔

واما المیراث فحکمۃ التفضیل	مرد کو میراث کے زیادہ ملنے کی وجہ بالکل
فیہ ظاھرۃ فان الذکر	واضح ہے۔ اسے عورت کے مقابلہ میں مال
احوج الی المال من الانثیٰ	کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ وہ قوام ہے
لان الرجال قوامون علی	(اسے عورت کے اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں)
النساء والذکر انفع للمیت	اس کے علاوہ میت کو اس کی زندگی میں مرد
فی حیاتہ من الانثیٰ وقد	سے زیادہ فائدہ پہونچتا ہے۔ اسی حقیقت کی
اشار سبحانہ تعالیٰ الی	طرف اللہ تعالیٰ نے وراثت کے حقوق متعین
ذٰلک بعد ان فرض الفرائض	کرنے اور ان کی مقدار میں فرق کرنے کے
وتفاوت بین مقادیرھا	بعد اشارہ فرمایا ہے کہ تم اس بات کو نہیں جانتے
اٰباؤکم وابناؤکم	کہ تمہارے باپ اور تمہاری اولاد میں سے
لا تدرون ایھم اقرب	کون تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔
لکم نفعا واذا کان الذکر	جب میت کی زندگی میں اسے عورت سے
انفع من الانثیٰ واحوج کان	زیادہ مرد سے فائدہ پہونچتا رہا ہے اور
احق بالتفضیل [1]	وہ مال کا حاجت مند بھی زیادہ ہے تو وہ
	اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے وراثت
	ترجیح دی جائے۔

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۶۳

بعض حالات میں دونوں میں فرق نہ ہونے کی وجہ

جہاں مرد کی معاشی ذمہ داریاں کم ہو جاتی ہیں وہاں اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان فرق نہیں کیا ہے۔ چنانچہ میت کی اولاد ہو تو اس نے ماں اور باپ دونوں کا حصہ وراثت میں ایک رکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اولاد کا حق مقدم ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ جس شخص کی اولاد بھی صاحبِ اولاد ہو وہاں اس کی ذمہ داریاں بڑی حد تک کم ہو جاتی یا ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کی حیثیت بالعموم اپنے پوتے پوتیوں کے سرپرست کی ہوتی ہے۔ ہاں اگر میت کے اولاد نہیں ہے، جو اس کی وراثت کی اولین مستحق ہے، اور میت کا باپ صاحب اولاد ہے، جو میت کے بھائی بہن ہوں گے۔ تو باپ کا حق ماں سے زیادہ ہوگا' اس لیے کہ اس صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہو سکتی ہیں۔

قریب کے رشتہ داروں کا حق زیادہ ہے

اسلام نے تقسیم وراثت اس اصول کی بنیاد پر کی ہے کہ خونی رشتوں میں جو میت سے جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اس کا حق مقدم ہوگا[1] دور کے رشتہ دار اسی وقت مستحق ہوں گے جب کہ قریب کے رشتہ دار موجود نہ ہوں یا قریب کے رشتہ داروں کو ان کا متعین حصہ ملنے کے بعد ترکہ بچ جائے۔ اس اصول کے تحت جو عورت میت سے رشتہ میں قریب ہے اس کا حق اس مرد سے زیادہ ہو سکتا ہے جو میت سے رشتہ میں دور ہے۔ فرض کیجئے میت کے صرف ایک لڑکی اور ایک بھائی ہے تو میت کا ترکہ دونوں میں مساوی تقسیم ہو جائے گا اگر ایک لڑکی اور دو بھائی ہیں تو لڑکی نصف ($\frac{1}{2}$) کی حقدار ہوگی اور

---

[1] اگر کوئی مرد میت سے رشتہ میں قریب ہے تو دور کے رشتہ دار وراثت سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی اصول کی بنا پر اولاد موجود ہو تو پوتے اور پوتیوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا یا باپ زندہ ہے تو میت کے بھائی اور بہنیں (یعنی باپ کی اولاد) وراثت کے حقدار نہ ہوں گے۔

دونوں بھائیوں کو نصف (½) ملے گا۔ اگر دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کا حصہ دو ثلث (⅔) ہوگا اور ایک یا ایک سے زائد بھائیوں کو صرف ایک ثلث (⅓) ملے گا۔

ان تفصیلات سے اس الزام کی صاف تردید ہوتی ہے کہ وراثت کے معاملہ میں عورت کے ساتھ عدل وانصاف نہیں ہوا ہے۔ اس میں نہ تو مرد کے ساتھ جانب داری برتی گئی ہے اور نہ عورت کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اسلام نے ایک طرف میت سے عورت کے رشتہ کو اہمیت دی ہے تو دوسری طرف مرد کی معاشی ذمہ داریوں کو سامنے رکھا ہے اس بنیاد پر وراثت میں عورت کا حصہ کہیں کم ہے تو کہیں زیادہ اور بعض حالات میں عورت اور مرد دونوں کے حصے مساوی بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ قرابت داری اور معاشی ذمہ داریوں کے درمیان بے مثال توازن ہے۔ یہ توازن اسلامی شریعت کی وہ نمایاں خصوصیت ہے جو اسے دوسرے مذاہب اور نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔

عورت کا قصاص

قصاص جان کا بھی ہوتا ہے اور جراحات اور زخموں کا بھی۔ جان کا قصاص یہ ہے کہ جو شخص ناحق کسی کو قتل کرے اس کے بدلے میں اسے قتل کردیا جائے۔ زخموں اور جراحات کا قصاص یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کو زخمی کردے یا اس کے کسی عضو کو نقصان پہونچائے تو اس کے مساوی اس سے بدلہ لیا جائے۔ قصاص کا یہ قانون انسان کے جسم وجان کی حفاظت کے لیے ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قانون عورت اور مرد دونوں کے لیے ایک ہے یا اسلام نے اس معاملہ میں ان کے درمیان کہیں کوئی فرق بھی کیا ہے؟ یہ سوال ہماری فقہ میں بہت پہلے سے زیر بحث رہا ہے اور اب حال میں جب سے عورت کے حقوق پر ہر طرف بحث چھڑی ہے یہ سوال پھر سے ابھر آیا ہے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس مسئلہ کی ضروری تفصیلات پیش کر کے راجح مسلک کی نشاندہی کی جائے۔

عورت کی جان کا قصاص مرد سے

قرآن مجید نے قصاص کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (البقرہ: ۱۷۸)

اے ایمان والو! تم پر مقتولین میں قصاص (برابری) فرض کردیا گیا ہے۔

اس کی حکمت اس طرح بیان کی ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرہ: ۱۷۹)

اے عقل مندو! تمہارے لیے قانون قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم اپنی جان جانے کے ڈر سے دوسروں کے قتل سے بچے رہو۔

توریت کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ: ۴۵)

ہم نے توریت میں یہودیوں پر یہ حکم فرض کردیا تھا کہ جان کے بدلے جان لی جائے گی۔

اس قانون کے تحت مرد عورت کو قتل کر دے تو مرد سے قصاص لیا جائے گا اور عورت مرد کو قتل کر دے تو مرد سے قصاص لیا جائے گا۔ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔

الرجل یقتل بالمرأۃ اذا قتلھا[1]

مرد اگر عورت کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اسے قتل کیا جائے گا۔

اس کی تائید اور روایتوں سے بھی ہوتی ہے۔ صحاح ستہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک انصاری لڑکی کا زیور چھیننے کے لیے اس کا سر کچل کر ایک گڑھے میں پھینک دیا۔ جان کنی کی حالت میں لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی گئی۔ جن لوگوں کے بارے میں قتل کا شبہ تھا ان میں سے ایک ایک کا نام لے کر اس سے پوچھا گیا تو اس نے سر کے اشارے سے انکار کیا، لیکن جب اس یہودی کا نام لیا گیا جس نے قتل کیا تھا تو اس نے اشارے ہی سے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد اس یہودی سے دریافت کیا گیا تو اس نے تھوڑے سے رد وکد کے بعد اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ چنانچہ قصاص میں اسے بھی پتھر مار کر ہلاک کر دیا گیا۔[2]

امام نووی فرماتے ہیں اس حدیث سے بہت سے مسائل نکلتے ہیں۔

منھا قتل الرجل بالمرأۃ و ھو اجماع من یعتد بہ[3]

ان میں سے ایک یہ ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اس پر قابل لحاظ سب ہی لوگوں کا اجماع ہے۔

---

[1] بیہقی: السنن الکبریٰ ۸/۲۸ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ ان الرجل یقتل بالانثی۔ اس حدیث کی سند پر جرح کی گئی ہے لیکن عام طور پر محدثین نے اسے قبول کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو التلخیص الحبیر ۲/۳۳۶، ۳۳۷

[2] بخاری، کتاب الدیات، باب سوال القاتل حتی یقر۔ مسلم، کتاب القسامۃ الخ، باب ثبوت القصاص فی القتل الخ۔ ابوداؤد کتاب الدیات، باب یقاد من القاتل۔ ترمذی، ابواب الدیات، باب ماجاء فی من رضخ راسہ بصخرۃ۔ نسائی، کتاب القسامۃ، باب القود من الرجل للمرأۃ

[3] شرح مسلم: ۲/۵۸۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیر مسلم مسلمان عورت کو قتل کر دے تو قصاص (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابوداؤد وغیرہ کی ایک لمبی روایت میں آتا ہے :۔

إِنَّ عقل المرأة بين عصبتها من كانوا لا يرثون منها شيئا الا ما فضل عن ورثتها فان قتلت فعقلها بين ورثتها وهم يقتلون قاتلهم[1]	عورت کی دیت (اگر وہ کسی ایسے جرم کا ارتکاب کر گزرے تو) اس کے عصبہ پر واجب ہوگی. عصبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اصحاب الفروض کو ان کے متعین حصے دینے کے بعد اس کی ساری وراثت کے حقدار ہوں گے (جیسے بیٹے، پوتے اور بھائی وغیرہ) لیکن اگر اس کا قتل ہو جائے تو اس کی جو دیت ملے گی وہ سب وارثوں کے درمیان تقسیم ہوگی اور وہ (قصاص لینا چاہیں تو) اپنے قاتل کو قتل کر سکیں گے ۔

وہ اپنے قاتل کو یعنی عورت کے قاتل کو قتل کریں گے۔ چنانچہ نسائی اور ابن ماجہ کی روایت میں قاتلہا (اس کے قاتل) کے الفاظ موجود ہیں[2] اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کے قصاص میں مرد کو قتل کیا جائے گا۔ عورت کے قاتل کو ورثاء کا قاتل قرار دینے سے اس کی قانونی حیثیت ظاہر ہوتی ہے گویا وہ صرف ایک عورت کا قاتل نہیں بلکہ اس کے سارے ورثاء کا قاتل ہے۔ انھیں یہ قانونی حق حاصل ہے کہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں، یا دیت پر راضی ہو جائیں یا معاف کر دیں۔

سید التابعین حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں :۔

الرجل يقتل بالمرأة اذا قتلها[3]	مرد کو عورت کے عوض قتل کیا جائے گا اگر وہ اسے قتل کر دے ۔

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) میں اسے قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن یہ اشکال بہر حال باقی ہے کہ کیا یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جب کہ قاتل مسلمان ہو۔ اس لیے کہ شریعت نے غیر مسلم اور مسلم کے قصاص میں فرق کیا ہے۔ مسلمان سے غیر مسلم کا قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ نیل الاوطار: ۱۶۲/۷ لیکن جس فرق کی بنیاد پر امام شوکانی نے اشکال ظاہر کیا ہے اس پر سب کا اتفاق نہیں ہے۔ احناف کے نزدیک ایک مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو قصاص میں اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ ہدایہ: ۵۵۹/۴

[1] ابوداؤد، کتاب الدیات، باب دیات الاعضاء۔ [2] نسائی، کتاب القسامۃ، باب کم دیۃ شبہ العمد۔ ابن ماجہ، ابواب الدیات، باب عقل المرأۃ علی عصبتہا الخ [3] بیہقی: السنن الکبریٰ: ۲۸/۸

امام بخاری فرماتے ہیں۔

قال اھل العلم یقتل الرجل بالمرأۃ [1]	اہل علم نے کہا ہے کہ مرد کو عورت کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

یہی رائے ائمہ اربعہ ، امام ابوحنیفہ ، امام مالک ، امام شافعی ، امام احمد اور عام علماء امت کی ہے [2]

علامہ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ مرد سے عورت کا اور عورت سے مرد کا قصاص لیا جائے گا۔ صحابہ میں حضرت علیؓ اور تابعین میں حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں آتا ہے کہ اگر مرد عورت کو قتل کر دے اور اس کے ورثاء قصاص میں اسے قتل کرنا چاہیں تو آدھی دیت دے کر قتل کر سکتے ہیں (اس لیے کہ عورت کی دیت نصف ہے) اگر وہ آدھی دیت نہ دیں تو انہیں عورت کی دیت مل جائے گی۔ لیکن حضرت علیؓ سے یہ ثابت نہیں ہے۔ یہ دراصل بصرہ کے فقیہ عثمان البتی کا قول ہے [3] یہ بھی آتا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ اور عطاؒ کی رائے بھی وہی تھی جو جمہور کی رائے ہے [4]

یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے اس لیے مرد سے اسی وقت قصاص لیا جائے گا جب کہ آدھی دیت اسے دے دی جائے۔ اس لیے کہ دونوں کی قذف کی سزا ایک ہے۔ عورت اگر مرد پر زنا تہمت لگائے تو اسے جو سزا دی جائے گی وہی سزا مرد کو دی جائے گی اگر وہ عورت پر یہ تہمت باندھے۔ مرد کو یہ سزا دینے کے لیے اسے کوئی بدل یا رقم نہیں دی جائے گی۔ قصاص میں قاتل اور مقتول کی قیمت نہیں دیکھی جاتی ہے، اسی وجہ سے ایک فرد کو پوری ایک جماعت مل کر قتل کرے تو بھی سب کو قتل کیا جائے گا [5]

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ قصاص کے مقصد اور حکمت سے بھی جمہور کے مسلک کی تائید

---

[1] بخاری، کتاب الدیات، باب القصاص بین الرجال والنساء۔

[2] ابن قدامہ: المغنی: ۷/۶۷۹ [3] فتح الباری: ۱۲/۱۶۰ نیز ملاحظہ ہو تفسیر کبیر: ۲/۱۰۸

[4] ابن قدامہ: المغنی ۷/۶۷۹ [5] المغنی ۷/۶۷۹

ہوتی ہے۔ قصاص کی حکمت یہ ہے کہ انسان کا خون نہ بہے اور ظلم و زیادتی سے اس کی جان محفوظ رہے۔ اگر مرد سے عورت کا قصاص نہ لیا جائے تو کئی ایک اسباب کی بنا پر اس کی جان ضائع جا سکتی ہے۔ ایک سبب وراثت سے اسے محروم کرنا ہے۔ جو شخص وراثت میں اسے اس کا حصہ نہ دینا چاہے وہ اسے قتل کر بیٹھے گا۔ دوسرا سبب دورِ جاہلیت کی طرح ذلت اور عار کا احساس ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ ان سے معمولی سی غلطی ہی سرزد ہو جائے۔ یہی غلط قسم کا احساس تھا جس کی وجہ سے جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ تیسرا سبب ان کی کمزوری ہے۔ جو شخص ان کو قتل کرنا چاہے اسے اس بات کا خوف نہیں ہوتا کہ وہ مردوں کی طرح مدافعت کریں گی۔ لہٰذا قصاص میں رخصت یا ڈھیل ہو تو عورت پر زیادتی بڑھ جائے گی اور اس کی جان لینا آسان ہو جائے گا۔[۱]

عورت کی جان کا قصاص عورت سے

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر امت کا تقریباً اجماع ہے یا کم از کم ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اتفاق ہے کہ مرد کے قصاص میں عورت کو اور عورت کے قصاص میں مرد کو قتل کیا جائے گا۔ اب ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں ہی عورتیں ہوں تو کیا ان کے درمیان بھی قصاص کا یہ قانون نافذ ہوگا؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ جب ایک عورت کے قصاص میں مرد کی جان لی جا سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کے قصاص میں عورت کو قتل نہ کیا جائے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں کہا ہے۔ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (البقرۃ: ۱۷۸) (عورت کے بدلہ عورت قتل کی جائے گی) چنانچہ فقہاء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عورت کے قصاص میں عورت کی جان لی جا سکتی ہے۔ قرآن شریف کے الفاظ عام ہیں اس سے فقہ حنفی میں یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ کوئی آزاد عورت کسی باندی کو قتل کر دے تو بھی اس سے قصاص لیا جائے گا۔[۲]

---

[۱] نیل الاوطار: ۷/۱۶۲ [۲] رد المختار علی الدر المختار ۵/۳۷۴

عورت کے جراحات کا قصاص

اب جراحات اور زخموں کے قصاص کو لیجئے۔ اس کی بھی وہ ساری شکلیں بنتی ہیں جو نفس کے قتل کی تھیں۔ ۱۔ عورت سے مرد کا قصاص لیا جائے۔ ۲۔ مرد سے عورت کا قصاص لیا جائے۔ ۳۔ عورت کا عورت سے قصاص لیا جائے۔

قرآن مجید میں قصاص کا حکم اس آیت میں ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ (المائدہ: ۴۵)	ہم نے تورات میں یہودیوں پر فرض کر دیا تھا (یہی حکم اب اس امت کے لیے بھی ہے) کہ جان کے بدلہ جان، آنکھ کے بدلہ آنکھ، ناک کے بدلہ ناک، کان کے بدلہ کان اور دانت کے بدلہ دانت۔ اور دوسرے (خاص) زخموں کا بدلہ بھی ان کے برابر ہے۔ پھر جو شخص زیادتی کرنے والوں کو معاف کر دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مرد عورت کی یا عورت مرد کی جان لے تو جس طرح ان سے قصاص لیا جاتا ہے، کیا اسی طرح اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو جسمانی طور پر مجروح کریں اور نقصان پہونچائیں تو ان سے قصاص لیا جائے گا؟ یا ان دونوں کے احکام الگ ہیں؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہل عرب عورت کے قصاص میں مرد کو قتل نہیں کرتے تھے بلکہ عورت کے قصاص میں عورت کو اور مرد کے قصاص میں مرد کو قتل کرتے تھے۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ مسلمان مرد اور عورت، اگر وہ آزاد ہیں تو، ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ ایک نے دوسرے کی عمداً جان لی یا اس سے کم تر درجہ کا نقصان پہونچایا تو اس سے برابر کا قصاص لیا جائے گا۔[1]

---

[1] مزید فرماتے ہیں کہ یہی اصول غلاموں اور لونڈیوں کے مابین بھی جاری ہوگا۔ ابن جریر: تفسیر ۶/۱۶۰ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام نووی فرماتے ہیں کہ صحابہ و تابعین اور بعد کے علماء میں سے جمہور نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ قصاص کا یہ قانون مردوں اور عورتوں کے درمیان بھی جاری ہوگا۔ ان میں سے ایک دوسرے کے قاتل کو قتل کیا جائے گا اور جو جسمانی ضرر اور نقصان پہونچائے اس سے اس کے برابر قصاص لیا جائے گا[۱]۔ مثال کے طور پر مرد عورت کا یا عورت مرد کا ہاتھ توڑ دے تو قصاص میں اس کا ہاتھ بھی توڑ دیا جائے گا لیکن اگر نقصان کی کوئی ایسی صورت ہو جس میں برابر قصاص لینا ممکن نہ ہو تو دیت لی جائے گی۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ان کی پھوپھی رُبَیّع نے ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑ دیا۔ رُبَیّع کے لوگ چاہتے تھے کہ معاف کر دیا جائے یا دیت لے لی جائے لیکن لڑکی کے خاندان والے قصاص پر اصرار کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ پہونچا تو آپ نے قصاص کا حکم دیا اس پر حضرت انس کے چچا (ربیع کے بھائی) نے کہا اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم ربیع کا دانت توڑا نہیں جائے گا۔ (یہ بات انھوں نے آپ کی تردید اور مخالفت میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین کی وجہ سے یا اس اعتماد پر کہ وہ لڑکی کے رشتہ داروں کو عفو و درگزر یا دیت پر آمادہ کر سکیں گے، کہی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے انس! کتاب اللہ کا حکم قصاص کا ہے یہ تو ضرور لیا جائے گا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد لڑکی والے قصاص کی جگہ دیت لینے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ وہ قسم کھالیں تو اللہ اسے پوری کر دیتا ہے[۲]۔

یہ بخاری وغیرہ کی روایت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت کو زخمی کر دے تو قصاص لیا جائے گا۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ربیع کی بہن ام حارثہ نے ایک شخص کو زخمی کر دیا۔ یہ جھگڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچا تو آپ نے فرمایا اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اس پر ربیع کی ماں نے کہا کیا ام حارثہ سے قصاص لیا جائے گا؟ خدا کی قسم

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) غلاموں اور لونڈیوں کا مسئلہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے۔ اس سے بحث کسی دوسرے موقع پر ہم ان شاء اللہ کریں گے۔ [۱] شرح مسلم: ۵۹/۲

[۲] بخاری، کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیۃ۔ کتاب التفسیر (سورۃ البقرہ) باب یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص (سورہ المائدہ) باب قولہ والجروح قصاص۔ ابوداؤد، کتاب الدیات باب القصاص فی السن۔

ایسا نہیں ہوگا۔ آپ نے ان سے فرمایا سبحان اللہ! ام الربیع تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ اللہ کی کتاب کا قانون ہے کہ قصاص لیا جائے۔ لیکن جو شخص زخمی ہوا تھا اس کے لوگ بعد میں دیت پر راضی ہو گئے۔ اس پر آپ نے فرمایا اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ قسم کھالیں تو اسے وہ پوری کر دیتا ہے[1]

امام نووی فرماتے ہیں اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

منھا اثبات القصاص بین الرجل والمرأۃ[2] — ان میں سے ایک یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان قصاص ہوگا۔

اب صحابہ و تابعین کے بعض اقوال پیش کئے جا رہے ہیں جن سے عورت سے مرد کے قصاص اور مرد سے عورت کے قصاص کا ثبوت ملتا ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں، حضرت عمرؓ سے روایت کی جاتی ہے کہ انھوں نے فرمایا۔

تقاد المرأۃ من الرجل فی کل عمد یبلغ نفسہ فما دونھا من الجراح[3] — عورت عمداً اگر مرد کو قتل کر دے یا اس سے کم تر درجہ میں کوئی چوٹ ہی پہونچا دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔

جب عورت سے مرد کے قتل اور جراحات یا زخموں کا قصاص لیا جائے گا تو مرد سے عورت

---

[1] مسلم، کتاب القسامہ، باب اثبات القصاص فی الاسنان الخ۔ امام بخاری نے یہ روایت ترجمہ باب میں نقل کی ہے۔ کتاب الدیات، باب القصاص بین الرجال والنساء الخ۔ دونوں روایتوں کی تفصیلات میں جو اختلاف ہے اس کی بنا پر امام بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ واقعات ہیں لیکن ابن ترکمانی نے اسے [illegible] ماننے سے انکار کیا ہے۔ السنن الکبریٰ مع الجوہر النقی: ۸/۳۹، ۶۴۔ علامہ ابن حزم کی رائے یہ ہے کہ یہ ایک ہی عورت کے دو واقعات ہیں۔ ایک میں اس نے ایک شخص کو زخمی کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کا فیصلہ فرمایا دوسرے میں انھوں نے دانت توڑا تو قصاص کا فیصلہ ہوا۔ پہلے واقعہ میں قسم کھانے والی ان کی ماں تھیں اور دوسرے میں ان کے بھائی نے قسم کھائی۔ فتح الباری ۱۲/۳، ۱۷۴۔ لیکن یہ تفصیل خود بھی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتی۔ امام نووی نے بھی انھیں دو واقعات ہی قرار دیا ہے۔ شرح مسلم: ۲/۵۹

[2] شرح مسلم: ۲/۵۹ [3] بخاری، کتاب الدیات، باب القصاص بین الرجال والنساء۔

کا بھی قصاص لیا جانا چاہیے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے۔

جرح الرجال والنساء سواء[۱]	مردوں اور عورتوں کے زخم مساوی ہیں

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں۔

القصاص فی مابین المرأة و الرجل حتی فی النفس[۲]	عورت اور مرد کے درمیان قصاص کا قانون نافذ ہوگا حتی کہ نفس کے معاملہ میں بھی۔

ابوالزناد، دور تابعین کے مشہور فقہاء سبعہ[۳] اور ان ہی جیسے دوسرے علماء اور فقہاء کے بارے میں فرماتے ہیں۔

انهم كانوا يقولون المرأة تقاد من الرجل عينا بالعين واذنا باذن وكل شيئ من الجراح على ذالك وان قتلها قتل بها[۴]	عورت سے مرد کا قصاص لیا جائے گا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان ہر طرح کے زخم کے بدلے اسی کے مساوی زخم۔ (اسی طرح مرد سے بھی عورت کا قصاص لیا جائے گا) اور مرد اسے قتل کردے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

اور سورہ مائدہ کی جو آیت گزر چکی ہے اس سے استدلال کرتے ہوئے امام مالک فرماتے ہیں۔

القصاص یکون بین النساء کما یکون بین الرجال و القصاص ایضا یکون بین الرجال والنساء[۵]	عورتوں کے درمیان اسی طرح قصاص ہوگا جس طرح مردوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اور مردوں اور عورتوں کے درمیان بھی قصاص ہوگا۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی کہتے ہیں کہ جن افراد کے درمیان ایک دوسرے سے نفس کا قصاص لیا جاتا ہے ان میں جراحات کا قصاص بھی ایک دوسرے سے لیا جائے گا۔ یہی امام مالک،

---

[۱] فتح الباری: ۱۲/۲/۱۷۴ [۲] حوالۂ سابق

[۳] فقہاء سبعہ سے حسب ذیل سات فقہاء مراد ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، خارجہ بن زید بن ثابت، عبیداللہ بن عبداللہ اور سلیمان بن یسار رحمہم اللہ۔

[۴] السنن الکبریٰ: ۸/۴۰ [۵] موطا امام مالک: کتاب العقول: القصاص فی القتل

امام ثوری، امام شافعی، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور اور امام احمد کی رائے ہے[1] اس اصول کے تحت چونکہ مرد کے قصاص میں عورت کی اور عورت کے قصاص میں مرد کی جان لی جاتی ہے لہٰذا وہ ایک دوسرے کو زخم پہونچائیں تو اس کا بھی ان سے قصاص لیا جائے گا۔

فقہ حنفی کی رو سے عورت اور مرد کے درمیان نفس کا قصاص تو ہے لیکن جراحات کا قصاص نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے جو بھی دوسرے کو قتل کرے قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا لیکن فرض کیجئے عورت مرد کا یا مرد عورت کا ہاتھ قطع کردے تو قصاص میں ان میں سے کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ دیت لی جائے گی۔ قتل سے عورت کی بھی جان جائے گی اور مرد کی بھی۔ جان کا ضیاع دونوں میں مشترک ہے۔ اس لئے دونوں سے ایک دوسرے کا قصاص لیا جائے گا۔ لیکن اعضاء کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کی نوعیت مال کی ہے۔ مال بھی نفس کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے اور اعضاء جسم کا مقصد بھی یہی ہے۔ ان میں قصاص اسی وقت ہوگا جب کہ ان کی قیمت ایک ہو۔ شریعت نے عورت کے اعضاء کی دیت مرد کی دیت سے کم رکھی ہے (اس سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے) جب دونوں کی مالیت میں فرق ہے تو ان کے درمیان قصاص نہیں ہوگا۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۵ میں قصاص کا جو حکم دیا گیا ہے وہ مطلق نہیں ہے۔ یہ بات سب ہی کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ حربی یا مستامن کا قصاص نہیں لیا جاتا۔ جب آیت کے حکم سے اسے مستثنیٰ کیا گیا ہے تو حدیث کے ذریعہ عورت کو بھی مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مردوں کے ہاتھ چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور توانائی اور قوت گرفت کے لحاظ سے ان میں فرق بھی ہوتا ہے جب ان کے درمیان قصاص میں فرق نہیں کیا جاتا تو عورت اور مرد کے ہاتھ میں جو فرق ہے اس کا بھی اعتبار نہیں ہونا چاہیئے، اس کا جواب یہ ہے کہ عورت اور مرد کے اعضاء کی دیت میں چونکہ فرق کیا گیا ہے اس لیے اس کا تو اعتبار کیا جائے گا لیکن مردوں کے ہاتھوں میں جو فرق ہے اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اس کا کوئی ضابطہ نہیں ہے لہٰذا انھیں ایک دوسرے کے مساوی سمجھا جائے گا۔[2]

---

[1] المغنی ۷/ ۶۷۹، ۶۸۰ [2] ہدایہ: ۴/ ۵۶۶۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھی جائے کفایہ: ۵/ ۱۲۶۷

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اعضاء کے قصاص میں دیت کی برابری کو بنیاد مانا جائے تو کم از کم عورت سے مرد کا قصاص لینا غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ مرد کے اعضاء کی دیت عورت کے اعضاء کی دیت سے زیادہ ہے۔ جو چیز زیادہ قیمتی ہے اس کا قصاص کم قیمت والی چیز سے کیوں نہیں لیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر عورت مرد کا ہاتھ کاٹ دے تو اس کا ہاتھ کاٹ دینا بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگا۔ اس لیے کہ مرد کے ہاتھ کی دیت عورت کے ہاتھ کی دیت کے برابر ہی نہیں، اس سے زیادہ ہے۔ حالانکہ فقہ حنفی میں اسے بھی صحیح نہیں قرار دیا گیا ہے[1]

فقہ حنفی کا مشہور مسلک یہی ہے لیکن فقہ حنفی ہی میں ایک رائے اس کے جواز کی بھی ملتی ہے۔ اس کے لحاظ سے عورت اگر مرد کا ہاتھ کاٹ دے تو قصاص میں اس کا ہاتھ بھی کاٹا جا سکتا ہے[2] اس رائے کو اگر مان لیا جائے تو یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

سر اور چہرے کے زخموں[3] کے بارے میں ایک رائے فقہ حنفی میں یہ ہے کہ ان میں بھی عورت اور مرد کے درمیان قصاص نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قصاص کے لیے منفعت اور قیمت میں برابری ضروری ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان یہ برابری نہیں ہے۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان زخموں میں عورت اور مرد کے درمیان قصاص ہوگا۔ اس لیے کہ اعضاء وجوارح کے قصاص اور ان زخموں کے قصاص میں فرق ہے۔ اعضاء وجوارح کٹ جائیں تو منفعت ختم ہو جاتی ہے اور عیب لاحق ہوتا ہے لیکن چہرہ کے زخموں میں منفعت میں تو کوئی فرق نہیں آتا البتہ عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں[4]

صرف چہرہ کے زخموں ہی سے عیب نہیں پیدا ہوتا اعضاء وجوارح کے کٹ جانے سے بھی عیب پیدا ہوتا ہے جب عیب کی بنیاد پر چہرہ کے زخموں کا قصاص ایک دوسرے

---

[1] المغنی ابن قدامہ : ۷/ ۶۸۰ [2] در المختار : ۵/ ۴۸۸

[3] ان زخموں کو 'شجاج' کہا جاتا ہے۔ ان کی قسمیں، ان کے احکام، کن اقسام میں قصاص واجب ہوتا ہے اور کن میں دیت، اس کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے ہدایہ ۴/ ۵۸۶ - ۵۸۸ -

[4] رد المحتار علی الدر المختار : ۵/ ۴۸۸

سے لیا جا سکتا ہے تو اعضاء وجوارح کا قصاص بھی لیا جانا چاہیئے۔ بہر حال منفعت کے سوال کو چھوڑ کر صرف عیب کے پہلو کو سامنے رکھا جائے تو فقہ حنفی کی رائے پر مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں دیگر ائمہ اور جمہور کا مسلک ہی زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ اعضاء وجوارح کے قصاص میں بھی عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

عورت کی دیت

ناحق کسی کی جان لینے یا اسے جسمانی نقصان پہونچانے پر شریعت نے جو مالی معاوضہ رکھا ہے اسے دیت کہا جاتا ہے۔ اسلام کے قانون دیت پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں عورت اور مرد کے درمیان فرق کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

فقہاء کے اختلافات

یہ ایک فقہی بحث ہے۔ اس میں فقہاء کی رائیں اور مسالک مختلف ہیں۔ ذیل میں اس کی تفصیل اور تجزیہ کی کوشش کی جائے گی۔

عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے

فقہاء احناف کے نزدیک عورت کی دیت، چاہے وہ جان کی ہو یا اعضاء وجوارح کی مرد کی دیت کے نصف ہے[1]

یہی امام شافعی، حضرت سفیان ثوری، امام لیث اور ابوثور وغیرہ کی رائے ہے[2] اس کی دلیل حضرت معاذ بن جبلؓ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

دیۃ المرأۃ علی النصف من دیۃ الرجل[3] — عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے۔

اس روایت کی سند کم زور ہے[4] البتہ حضرت علی فرماتے ہیں۔

---

[1] ہدایہ ۴/۵۸۶ [2] بدایۃ المجتہد ۲/۴۶۳۔ المغنی ۷/۷۹۷ [3] بیہقی: السنن الکبریٰ: ۸/۹۵

[4] اس کی سند کے بارے میں امام بیہقی کہتے ہیں لا یثبت مثلہ ؛ اس طرح کی سند ثابت نہیں ہوتی حوالہ سابق ۸/۹۶

جراحات النساء علی النصف من دیۃ الرجل فی ماقل وکثر[1]	عورت کے جراحات کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ۔

ابراہیم نخعی حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا۔

عقل المرأۃ علی النصف من دیۃ الرجل فی النفس ومادونہا[2]	عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہے چاہے وہ جان کی دیت ہو یا اس سے کم کسی نقصان کی۔

یہی رائے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی بھی بیان کی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مجھے ان کی یہ رائے کہیں نہیں ملی[3]

سوال یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مرد چونکہ خاندان کا کفیل ہوتا ہے اور اس کا معاشی بوجھ اٹھاتا ہے اس لیے اس کے انتقال سے خاندان کا مالی نقصان اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جتنا عورت کے انتقال سے ہوتا ہے، اس لیے عورت کی دیت سے مرد کی دیت دگنی رکھی گئی ہے۔ رشید رضا مصری کہتے ہیں:-

والاصل فی ذالک ان المنفعۃ التی تفوت اھل الرجل بفقدہ اکبر من المنفعۃ التی تفوت بفقد الانثیٰ فقدرت بحسب الارث[4]	اس مسئلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ مرد کے انتقال سے اس کے گھر والے جس فائدہ سے محروم ہوتے ہیں وہ اس فائدہ سے بہت بڑا ہے جس سے انھیں عورت کے انتقال کی وجہ سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا میراث میں جس طرح مرد کا حصہ دوگنا ہے اسی طرح دیت بھی اس کی دگنی کی گئی۔

ایک اور بات بھی کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی قانون کی رو سے بعض اہم دینی مناصب کے لیے مرد ہی کو موزوں سمجھا گیا ہے۔ جیسے نماز اور حج کی امامت، اس کے علاوہ ریاست کی

---

[1] حوالۂ سابق [2] بیہقی: السنن الکبریٰ ۹۶/۸ ۔ امام بیہقی کہتے ہیں یہ روایت منقطع ہے لیکن اوپر کی روایت کی تائید کرتی ہے۔ حضرت عمرؓ سے اس سے مختلف روایت بھی آتی ہے۔ بیہقی ۹۷/۸

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ التلخیص الکبیر: ۳۲۹/۲ [4] تفسیر المنار: ۳۳۲/۵

سربراہی، فوجی خدمات، سرحدوں کی حفاظت جیسی اجتماعی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی مرد ہی پر ڈالا گیا ہے۔ خالص دنیوی معاملات میں بھی جو صنعتیں اور پیشے انسان کی بقا کے لیے ضروری ہیں ان میں بھی اس کا حصہ زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے مرد کے قتل سے خاندان ہی کا نہیں پورے معاشرہ کا جو نقصان ہوتا ہے وہ اس نقصان سے زیادہ ہے جو عورت کے قتل سے ہوتا ہے۔ اس لیے فطری طور پر اس کی دیت بھی عورت کی دیت سے دوگنی رکھی گئی ہے[1]

اس میں شک نہیں ان دلائل میں کافی وزن ہے۔ لیکن احکام شریعت کا فیصلہ محض عقلی دلائل کی بنیاد پر نہیں ہوتا اس کے لیے قرآن وسنت سے مضبوط دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں جن روایات اور آثار کو پیش کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم نے عرض کیا، وہ کچھ زیادہ قوی نہیں ہیں۔

ثلث دیت کے بعد عورت کی دیت نصف ہے

امام مالک اور امام احمد وغیرہ کے نزدیک ایک ثلث دیت تک مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے البتہ ایک ثلث کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہو جائے گی[2]

اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

عقل المرأة مثل عقل الرجل	عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے یہاں
حتی یبلغ الثلث من دیتها[3]	تک کہ اس کی دیت ایک ثلث کو پہنچ جائے۔

اس روایت میں بھی ضعف ہے[4]

اس مسلک کی تائید میں حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ قول پیش کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جراحات الرجال والنساء سواء	مردوں اور عورتوں کے زخموں کی دیت ایک

---

[1] ملاحظہ ہو۔ اعلام الموقعین ۲/۱۱۲ [2] المغنی: ۷/۷۹۷-۷۹۸

[3] نسائی، ابواب القسامہ، عقل المرأة۔ دارقطنی کتاب الحدود والدیات/۳۲۶-۳۲۷

[4] ملاحظہ ہو: بیہقی ۸/۹۶، التعلیق المغنی: ۳/۳۲۷ علامہ زرقانی کہتے ہیں، اسنادہ ضعیف۔ شرح الزرقانی علی الموطأ: ۴/۳۴

الی الثلث فما زاد فعلی النصف[۱] تک برابر ہے جو زیادہ ہو وہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہوگی۔

اسی قسم کی ایک روایت حضرت عمرؓ سے بھی آتی ہے[۲]

حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ ایک تہائی دیت تک عورت اور مرد کی دیت برابر ہوگی۔ چاہے وہ انگلی کی ہو یا دانت کی، جسم کے زخم کی ہو یا سر کے چوٹ کی (اس کے بعد اس کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہو جائے گی)

امام مالک فرماتے ہیں امام زہریؒ اور عروہ بن زبیرؒ کی رائے بھی وہی ہے جو حضرت سعید بن مسیبؒ کی رائے ہے[۳]

کہا جاتا ہے کہ یہی جمہور اہل مدینہ اور تابعین کے مشہور فقہاء سبعہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ امام لیث، قتادہ وغیرہ کی رائے ہے[۴]

قاضی ابن رشد مالکی ہیں۔ وہ ان دلائل کے بارے میں فرماتے ہیں ولا اعتماد للطائفة الاولی الامراسیل[۵] (پہلے گروہ — اس سے مراد امام مالک وغیرہ ہیں — کا اعتماد اس مسئلہ میں صرف چند مرسل روایات پر ہے)

یہ ان کی سندوں کا حال ہے۔ اب اس پر عقلی انداز سے غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی کیا حکمت ہے کہ ایک تہائی دیت تک تو عورت اور مرد دونوں کو مساوی قرار دیا جائے اور ایک تہائی کے بعد دونوں میں فرق کر کے عورت کی دیت کو مرد کی دیت کا نصف کر دیا جائے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ایک تہائی دیت میں بھی نصف کر دیا جائے تو اس کی دیت نفاذ

۱؎ بیہقی: ۸/۹۶۔ ۲؎ حوالہ سابق ۳؎ موطا امام مالک، کتاب العقول، باب عقل المرأة

۴؎ زرقانی: شرح الموطا: ۴/۲۴۔ ابن قدامہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس پر دو صحابہ میں گویا اجماع ہو چکا ہے۔ صرف حضرت علیؓ کی ایک رائے اس کے خلاف بیان کی جاتی ہے۔ لیکن یہ ان سے ثابت نہیں ہے۔ المغنی: ۷/۷۹۸ اس پر بھی عرض کیا جا سکتا ہے کہ اجماع کا دعویٰ جتنا آسان ہے اس کا ثابت کرنا شاید اتنا آسان نہیں ہے۔

۵؎ بدایۃ المجتہد: ۲/۳۶۳۔

کم ہوجاتی ہے اور عورت کے نقصان کی تلافی نہیں ہوپاتی۔ اس لیے تہائی تک تو مرد اور عورت دونوں میں فرق نہیں کیا گیا البتہ اس کے بعد فرق کیا گیا۔[1]

اوپر کی روایات کو اگر مان لیا جائے تو یہ جواب بظاہر بہت معقول معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس اصول کے تحت جن جراحات اور زخموں پر عورت کو ایک تہائی دیت ملتی ہے ان سے بڑے جراحات پر اس کی دیت تہائی سے بھی کم ہوجاتی ہے۔ حالانکہ عقل کا صریح تقاضا ہے کہ عورت کے نقصان کے تناسب سے اس کی دیت میں اضافہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ موطا کی روایت کے مطابق ربیعہ بن عبدالرحمنؒ اور حضرت سعید بن مسیبؒ کے درمیان اس مسئلہ پر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ربیعہ! حضرت! عورت کی ایک انگلی کی دیت کیا ہوگی؟

سعید بن مسیبؒ! دس۱۰ اونٹ

ربیعہ! دو انگلیوں کی دیت؟

سعید بن مسیبؒ! بیس۲۰ اونٹ

ربیعہ! تین انگلیوں کی دیت؟

سعید بن مسیبؒ! تیس۳۰ اونٹ

ربیعہ! اچھا تو چار انگلیوں کی دیت؟

سعید بن مسیبؒ! بیس اونٹ (اس لئے کہ ایک آدمی کی جان کی دیت سو اونٹ ہے۔ عورت کی دیت جب ایک تہائی سے بڑھ جائے تو ان کے نزدیک آدھی ہوجاتی ہے۔)

ربیعہ! جب عورت کا زیادہ نقصان ہو اور اس کی تکلیف بڑھ جائے تو کیا دیت کم ہوجائے گی؟

سعید بن مسیبؒ! کیا تم عراقی ہو جو عقل لڑا رہے ہو اور نص کے مقابلہ میں قیاس کرتے ہو؟

ربیعہ! نہیں میں ایک طالب علم ہوں، مسئلہ کی نوعیت جاننا چاہتا ہوں۔

سعید بن مسیب! بیٹے یہی سنت ہے۔[2]

---

[1] اعلام الموقعین: ۱۱۲/۲

[2] موطا امام مالک، کتاب العقول، باب ماجاء فی عقل الاصابع، حضرت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

متاخرین میں امام شوکانی اسی رائے کے قائل ہیں کہ ثلثِ دیت کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ اس اعتراض میں وزن محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ثلث دیت کے بعد عورت کی دیت اس وقت کم ہو جاتی ہے جب کہ عقل کا صریح تقاضا ہے کہ اسے زیادہ ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک ایک تہائی دیت تک کو عورت اور مرد کی دیت ایک ہوگی۔ ایک تہائی کے بعد جو زائد دیت ہوگی صرف اس میں نصف ہو جائے گی۔ مثلاً جہاں چالیس اونٹ دیت میں مرد کو ملیں گے وہاں عورت کی دیت بینتیس[؂] ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی جو روایت اس ذیل میں پیش کی جاتی ہے وہ اس مفہوم کے لینے میں مانع نہیں ہے۔ باقی رہی حضرت سعید بن مسیبؒ کی روایت تو یہ مرسل ہے اس لیے ناقابل قبول ہے یہی نہیں بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ حدیث کا یہ مفہوم لینا ضروری ہے۔

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) سعید بن مسیبؒ تابعی ہیں۔ ان کی یہ روایت مرسل ہے۔ اس لیے کہ اس میں اس صحابی کا ذکر نہیں ہے جن سے انھیں یہ علم ہوا کہ دیت کے مسئلہ میں یہی سنت ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ سعید بن مسیبؒ کی روایات بھی دوسروں کی مرسل روایات کے مقابلہ میں زیادہ صحیح ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس طرح کی روایات کی سند موجود ہے۔ زرقانی: شرح موطا ۳۹/۵۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت سعید بن مسیب نے اسے سنت کس معنی میں کہا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں "ممکن ہے ان کا یہ قول رسول اللہ ہی سے منقول ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ان کے عام اصحاب علم کی یہ رائے ہو۔ پہلے میری بھی یہی رائے تھی۔ پھر میں نے یہ رائے ترک کر دی۔ اور اللہ سے دعا کرتا رہا اس لئے کہ بعض اوقات لوگ ایک بات کو سنت کہتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا اس مسئلہ میں صحیح طریقہ یہی ہے کہ قیاس کیا جائے۔ (اور وہ امام شافعی کے نزدیک جیسا کہ گزر چکا ہے کہ عورت کی دیت چھوٹی ہو یا بڑی مرد کی دیت کی نصف ہوگی) باقی رہا حضرت زید بن ثابت کا قول تو اس کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کا قول ہے (دونوں اقوال اوپر گزر چکے ہیں) وہ بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح یہ ثابت ہے۔ بیہقی: السنن الکبریٰ: ۹۶/۸۔ مزید فرماتے ہیں کہ امام مالک بھی اسے سنت کہا کرتے تھے۔ چنانچہ میں اس مسئلہ میں ان کی اتباع کرتا تھا۔ لیکن مجھے کھٹک ضرور تھی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ سنت سے مراد ان کی اہل مدینہ کی سنت ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے رجوع کر لیا۔ التلخیص الحبیر ۴۰/۲

لئلا یقتحم الانسان فی مضیق	تاکہ انسان عدل وانصاف، عقل اور قیاس کے
مخالف للعدل والعقل والقیاس	مخالف تنگنائے میں بغیر کسی واضح دلیل کے
بلا حجۃ نیرۃ [1]	پھنس نہ جائے۔

بعض اور اختلافات

دیت کے مسئلہ میں اور بھی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ثلث دیت کے بعد عورت کی دیت نصف ہوجاتی ہے ان کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ فی نفسہ ثلث اس میں داخل ہے یا نہیں؟ ایک رائے یہ ہے کہ ایک ثلث سے پہلے عورت اور مرد کی دیت مساوی ہوگی۔ جیسے ہی وہ ایک ثلث کو پہونچے گی نصف ہوجائے گی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ثلث تک دونوں کی دیت برابر ہوگی۔ ثلث کے بعد نصف ہوگی۔ ابن قدامہ حنبلی نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روایت کے الفاظ 'حتی یبلغ الثلث' (یہاں تک کہ وہ ثلث کو پہنچ جائے) بتلاتے ہیں کہ ثلث سے کم ہی میں مرد اور عورت کی دیت برابر ہوگی [2]

بعض حضرات ثلث دیت تک بھی عورت اور مرد کی دیت میں برابری کے قائل نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دانت کی دیت اور موضحہ (وہ زخم جس سے ہڈی نظر آنے لگے) کی دیت تو عورت اور مرد کی برابر ہوگی اس کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہوجائے گی [3]

حدیث میں آتا ہے کہ دانت کی دیت پانچ اونٹ ہے [4] اور موضحہ کی دیت بھی یہی بیان ہوئی ہے [5] اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف پانچ اونٹ تک عورت اور مرد کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اس کے بعد عورت کی دیت آدھی ہوجائے گی۔ قاضی شریح کا بھی یہی مسلک

---

[1] نیل الاوطار: ۷/۲۲۶ [2] المغنی: ۷/۷۹۸ [3] السنن الکبریٰ: بیہقی ۸/۹۶

[4] نسائی، قسامہ، عقل الاسنان [5] ابوداؤد، کتاب الدیات باب دیات الاعضاء، ترمذی، ابواب الدیات

باب ماجاء فی الموضحہ۔ نسائی، قسامہ، المواضح۔ فقہ حنفی میں بھی یہی دیت بیان ہوئی ہے۔ ہدایہ: ۴/۵۸۶، ۵۸۷

بتایا جاتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ملتی ہے کہ پندرہ اونٹ تک دونوں کی دیت ایک ہوگی اس کے بعد آدھی ہو جائے گی۔

اس کے برخلاف حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ نصف دیت تک (پچاس اونٹ) عورت اور مرد کی دیت مساوی ہوگی۔ اس کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہو جائے گی۔[1]

تقریباً یہی رائے بعض علمائے متاخرین کے یہاں بھی ملتی ہے۔ علامہ عبدالرؤف مناوی جو شافعی ہیں فرماتے ہیں کہ عورت کے اعضاء و جوارح کی دیت ثلث تک مرد ہی کی دیت کی طرح ہے لیکن جب وہ بڑھ کر نصف تک پہونچ جائے تو عورت کی دیت مرد کی دیت کی آدھی ہوگی۔[2]

ٹھیک یہی بات علامہ محمد بن عبدالہادی سندھی نے بھی کہی ہے جو حنفی المسلک ہیں۔[3]

اس طرح جمہور کا اصولاً اس پر تو اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے نصف ہوگی لیکن اس کی تفصیلات میں ان کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ عورت کی ہر چھوٹی بڑی دیت مرد کی دیت کی نصف ہوگی یا زائد از ثلث کی نصف ہوگی یا کل دیت کی جب آدھی ہو جائے تو اس کی نصف ہوگی؟ اس کے علاوہ اور بھی اختلافات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں قرآن مجید میں کوئی واضح اور دوٹوک ہدایت نہیں ہے۔ جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ اتنی قوی نہیں ہیں کہ ان کی بنیاد پر کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال بھی مختلف ہیں۔ اسی وجہ سے فقہاء کی رایوں میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ ان تمام رایوں کی گنجائش موجود ہے۔ ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح بھی دی جا سکتی ہے اور ان سب کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر مزید غور و فکر بھی ہو سکتا ہے۔

ایک قابلِ غور رائے

اس مسئلہ میں ایک اور رائے بھی ہمیں ملتی ہے۔ یہ رائے اصم اور مفسر ابن عطیہ کی ہے۔

---

[1] قاضی شوکانی کہتے ہیں: وھٰذہ الاقوال لادلیل علیھا یعنی ان سب اقوال کے پیچھے کوئی دلیل نہیں۔ نیل الاوطار: ۷/۲۲۶

[2] التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/۱۳۳ [3] حاشیۃ السندی علی النسائی: ۲/۲۴۷

وہ کہتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کی دیت ایک ہے۔ اصم کا استدلال قرآن مجید کی اس آیت سے ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ (النساء: ۹۲)	جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور اس کے گھر والوں کو دیت پہونچائے۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں مسلمان مرد اور عورت دونوں کے قتل کا حکم بیان ہوا ہے۔ ان کی دیت بھی اس آیت کی رو سے ایک ہی ہونی چاہیے[1]

علامہ رشید رضا مصری کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیت میں، بغیر کسی قید کے 'دیت' کا مطلق ذکر کیا ہے۔ لفظ کے اندر عموم پایا جاتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ دیت کی جس مقدار پر بھی مقتول کے ورثاء راضی ہو جائیں وہ درست ہوگی، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ، لیکن سنت نے اس کی تحدید کر دی ہے۔ اس میں اس رواج کو سامنے رکھا گیا ہے جو عرب میں معروف اور مقبول تھا فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک آزاد مسلمان کی، جس نے کوئی ایسا جرم نہ کیا ہو جس سے اس کا خون مباح ہو جائے، دیت سو اونٹ یا اس کی قیمت ہے اور عورت کی دیت اس کے نصف ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

ظاهر الآية انه لا فرق بين الذكر والانثى[2]	آیت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معروف فقہاء نے اس رائے کو اختیار نہیں کیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کی دیت ایک ہے، اس لیے یہ ایک شاذ رائے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال قابل غور ہے اور اس پر ضرور غور ہونا چاہیے۔

---

[1] تفسیر کبیر: ۲۹۷/۳ [2] تفسیر المنار: ۳۲۲/۵، ۳۲۳

عورت کی شہادت

اسلام کے قانونِ شہادت پر ایک اعتراض یہ ہے کہ اس میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔ یہ عورت کی توہین اور اس کے ساتھ غیر مساوی رویہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے بہت سے معاملات میں عورت اور مرد کی شہادت میں فرق کیا ہے، لیکن اسے عورت کی توہین سمجھنا سراسر زیادتی اور اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے یہ فرق اسلام نے زبردستی نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اس کے اسباب خود عورت کی فطرت، اس کے مزاج اور اس کے دائرۂ عمل کے اندر موجود ہیں۔ اس مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کو کسی قدر تفصیل سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسلام نے شہادت کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔

حدود و قصاص میں شہادت

کسی شخص پر حد کے نفاذ یا اس سے قصاص لینے کے لیے دو مردوں کی گواہی ضروری ہے۔ البتہ زنا کے ثبوت کے لئے چار مردوں کی شہادت لازمی ہے۔ اس کے بغیر زنا کا الزام ثابت نہ ہوگا اور حد جاری نہیں ہوگی۔ قرآن مجید نے زنا کے ثبوت کے لئے نصاب شہادت کا ذکر ان آیات میں کیا ہے:۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ	تمہاری عورتوں میں سے جو زنا کا ارتکاب
نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ	کریں ان پر اپنوں میں سے چار مردوں کو
اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (النساء: ۱۵)	گواہ ٹھہراؤ۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ	جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی
ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ	تہمت لگائیں اور اس پر چار مرد گواہ نہ
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً (النور:۴)	پیش کریں ان کو اسی کوڑے مارو۔

ان آیات میں 'اربعۃ منکم' (تم میں کے چار مرد) 'اربعۃ شہداء' (چار مرد گواہ) کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ زنا کے ثبوت کے لئے چار مردوں کی شہادت ضروری ہے[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ حدود و قصاص میں صرف مردوں کی شہادت معتبر ہو گی عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ مشہور تابعی امام زہری کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں اسی اصول پر عمل ہوتا تھا فرماتے ہیں:۔

مضت السنة من لدن	نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد
النبی صلی اللہ علیہ وسلم و	کے دونوں خلفاء (شیخینؓ) کے عہد
الخلیفتین من بعدہ ان لا	سے یہ سنت رہی ہے کہ حدود و قصاص
شہادۃ للنساء فی الحدود	میں عورتوں کی شہادت قابل قبول
والقصاص[2]	نہیں۔

اسلام نے انسان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے حدود و قصاص رکھے ہیں۔ کوئی کسی کو قتل کر بیٹھے تو قصاص میں اس کی جان لی جاتی ہے۔ بے شادی شدہ شخص زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوڑے لگائے جاتے ہیں یہی جرم شادی شدہ سے ہو تو اسے سنگسار کیا جاتا ہے۔ چوری ثابت ہو جائے تو چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ تہمت تراشی

---

[1] یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب قتل جیسے جرم کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی شہادت کافی ہے تو آخر زنا ہی کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی شہادت کو کیوں ضروری قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ سوسائٹی میں اس بے حیائی کا ذکر اور چرچا ہو۔ اگر کسی سے یہ جرم سرزد ہو بھی جائے تو اس پر پردہ ڈال دیا جائے۔ زنا کی سزا اس وقت دی جائے جب کہ چار عینی شاہد اس کی گواہی دیں۔

[2] ابن حجر: الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ ص۲۹۵

اور شراب نوشی پر بھی سخت سزائیں رکھی گئی ہیں۔ جن جرائم پر اسلام نے حدود رکھے ہیں یا قصاص کا حکم دیا ہے وہ اتنی سنگین نوعیت کے ہیں کہ ان کے ارتکاب کے بعد آدمی زندہ بھی رہے تو سوسائٹی میں اس کا وقار بری طرح مجروح ہو جاتا ہے اور اس کی عزت اور احترام باقی نہیں رہتا۔ ان جرائم کے ثبوت کے لئے عورتوں کی شہادت قبول نہ کئے جانے کی وجہ بظاہر ان کی یہی مخصوص نوعیت اور اہمیت ہے۔ عورت اصلاً گھر کی منتظم ہے اس کا ایک اپنا ذہن و مزاج ہے اور ایک خاص ماحول میں اس کی نشوونما اور تربیت ہوتی ہے۔ اسے اُن حالات اور اسباب سے کم ہی سابقہ پیش آتا ہے جن میں یہ بھیانک جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں اس کا علم اور مشاہدہ اتنا مکمل نہیں ہو سکتا جتنا مرد کا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ عورت کے لیے اپنے مزاج کی نرمی اور احساس کی شدت کی وجہ سے انفرادی اور اجتماعی قتل، چوری، ڈکیتی اور عصمت دری جیسے بھیانک جرائم کا اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ مشاہدہ کرنا انھیں پوری طرح محفوظ رکھنا اور ٹھیک ٹھیک بے کم و کاست عدالت کے سامنے پیش کرنا آسان نہیں ہے ان معاملات میں اس کے بیانات سے عدالت کو وہ یقین نہیں حاصل ہو سکتا جو مرد کے بیانات سے ہوتا ہے اس میں شک و شبہ کا پہلو غالب رہے گا۔ اسلام کا حکم ہے کہ بغیر مضبوط ثبوت کے حدود پر عمل نہ کیا جائے اور ملزم کو اس سے بچانے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم[1]	جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو دفع کرو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جہاں شبہ موجود ہو حدود پر عمل نہ کیا جائے۔

ادرؤا الحدود بالشبہات[2]	شبہات کی موجودگی میں حدود کو ٹال دو

بعض عورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا مشاہدہ قتل، چوری، ڈکیتی اور عصمت دری کی بھیانک

---

[1] ترمذی۔ ابواب الحدود، باب ماجاء فی درء الحدود۔ یہ روایت مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے آئی ہے۔ امام ترمذی نے موقوف کو صحیح قرار دیا ہے۔ [2] یہ حدیث سنداً کمزور ہے لیکن کئی سندوں سے مروی ہے اس لئے قابل احتجاج ہے۔ نیل الاوطار ۷/۲۰۲

شکلوں میں بھی قابلِ اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ انھیں عدالت کے سامنے ٹھیک طریقے سے پیش بھی کر سکتی ہیں لیکن بحیثیت ایک نوع کے عورت کا مزاج اس کا متحمل نہیں ہے۔ ظاہر ہے فیصلہ جب کسی نوع کے بارے میں کیا جائے گا تو اس کے چند افراد کو نہیں بلکہ اس کی بہت بڑی اکثریت کو سامنے رکھا جائے گا۔

حقوق و معاملات میں شہادت

حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے حقوق اور معاملات میں عورت کی شہادت قبول کی جائے گی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ حدود و قصاص کی جو اہمیت ہے دوسرے معاملات کی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا تعلق روزمرہ کے مسائل سے ہے۔ عورت کا دائرۂ عمل گھر ہونے کے باوجود ان معاملات سے اسے برابر سابقہ پیش آتا رہتا ہے۔ البتہ اس کے مخصوص حالات اور اس کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے دو اقدامات کئے گئے۔ ایک یہ کہ کسی معاملہ کا فیصلہ صرف عورتوں کی شہادت پر نہ کیا جائے، بلکہ اس وقت کیا جائے جبکہ یا تو اس کے حق میں دو مردوں کی شہادت ہو یا کم از کم ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں۔ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں رکھنے کی وجہ قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ کسی واقعہ کی تفصیلات عورت بھول سکتی ہے۔ ایک عورت سے بھول ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔ ارشاد ہے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ	اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ کر لو، اگر
رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا	دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں
رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ	ہوں ان لوگوں میں سے جن کو تم گواہ بنانا
تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ	پسند کرو تاکہ ایک ان میں سے بھول جائے
اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا	تو دوسری اسے یاد دلا دے۔
الْاُخْرٰى (البقرہ : ۲۸۲)	

آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ عورتوں کی گواہی اسی وقت قبول کی جائے گی جبکہ دو مرد موجود نہ ہوں، لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ شہادت میں یا تو

دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ جن معاملات میں عورت کو حقِ شہادت حاصل ہے ان میں مردوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔ آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ عورتوں سے الگ شہادت نہیں لی جائے گی بلکہ شہادت کے وقت دونوں ایک ساتھ ہوں گی تاکہ جن باتوں کو ایک بھول رہی ہو اسے دوسری یاد دلادے[1]

آیتِ زیرِ بحث قرض کے احکام کے ذیل میں آئی ہے۔ اس لیے جمہور ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرض کے لین دین اور مالی معاملات میں عورت کی شہادت قبول کی جائے گی[2]

احناف کے نزدیک ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی صرف حدود و قصاص میں قبول نہیں کی جائے گی۔ اس کے سوا تجارت، قرض، مالی لین دین، عاریت، اجارہ، کفالت، نکاح، وکالت، طلاق، وصیت، وراثت وغیرہ تمام حقوق و معاملات میں ان کی شہادت قابل قبول ہوگی۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ شہادت کے لئے تین باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ واقعہ کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اسے پوری طرح یاد رکھا جائے۔ تیسرے یہ کہ اسے من وعن بیان کیا جائے۔ عورت کی کمزوری قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ تفصیلات کو بھول سکتی ہے اس کی تلافی ایک مرد کی جگہ دو عورتیں رکھ کر دی گئی۔ لہٰذا حدود و قصاص کے علاوہ اور معاملات میں اس کی شہادت قبول کی جانی چاہیے۔

یہاں ایک سوال یہ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے تو جن معاملات کا فیصلہ دو مردوں کی شہادت پر ہوتا ہے ان کا فیصلہ چار عورتوں کی شہادت پر بھی ہونا چاہیے۔ اس کا جواب فقہاء نے یہ دیا ہے کہ عقلاً یہ بات صحیح ہے لیکن اگر اسے جائز قرار دے دیا جائے تو عورتوں کی گھر سے باہر آمدورفت بہت بڑھ جائے گی۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ گھر سے باہر زیادہ نہ نکلیں[3]۔ (اس لیے کہ اس سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں وہ بڑے ہی خطرناک ہیں ان سب کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔)

---

[1] فتح الباری ج ۵/۱۶۹ [2] ایضاً ۵/۱۶۹ [3] ہدایہ ۳/۱۵۴ مع شروح ہدایہ

عورتوں کے مخصوص مسائل میں شہادت

اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو معاملات عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں عورتوں کی شہادت کافی ہے جیسے ولادت کے وقت بچہ کی زندگی کی شہادت۔ اس لیے کہ بچہ زندہ پیدا ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس سے متعلق احکام وراثت پر عمل ہوگا ورنہ نہیں۔ یا اس امر کی شہادت کہ کوئی عورت بالغ ہے یا نابالغ، باکرہ ہے یا نہیں۔ یا عورتوں کے مخصوص جنسی عیوب اور امراض کی شہادت۔ ان سب باتوں کا بعض اوقات نکاح اور اس سے متعلق مسائل پر اثر پڑتا ہے[1]

اس مسئلہ میں امام زہری کا بیان ہے:۔

مضت السنة ان تجوز شهادة النساء فی ما لا يطلع عليه غيرهن من ولادات النساء وعيوبهن	سنت یہ رہی ہے کہ صرف عورتوں کی شہادت ان معاملات میں جائز ہے جن سے ان کے علاوہ دوسرا واقف نہیں ہوتا۔ یعنی عورتوں کے بچہ جننے کے وقت اس کی حالت یا ان کے عیوب۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ حضرت سعید بن المسیبؒ حضرت عروہ بن زبیرؒ کے اقوال اس کی تائید میں ملتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے ایک دایہ کی گواہی پر فیصلہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی ایک دایہ کی شہادت کو تسلیم کیا کہ بچہ زندہ پیدا ہوا تھا۔[2]

فقہاء کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ عورتوں کے مخصوص مسائل میں کتنی عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ عام طور پر اس کے لیے چار عورتوں کا نصاب رکھا گیا ہے۔ امام مالک اور ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ اس میں دو عورتوں کی شہادت پر فیصلہ ہوگا۔ امام ثوری

---

[1] بعض تفصیلات میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کی گئی ہے۔

[2] الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ /۲۹۵

اور احناف کے نزدیک ایک عورت کی شہادت بھی کافی ہے[1]

احناف نے اس کی دو دلیلیں دی ہیں ایک یہ کہ اوپر کی روایت میں تعداد کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی ہے اس لیے ایک عورت کی شہادت بھی کافی ہونی چاہیے۔ دوسری دلیل یہ کہ عورتوں کے مخصوص مسائل میں صرف انھیں کی شہادت کو اس کے لیے کافی سمجھا گیا اور مرد کی شہادت کو ضروری نہیں قرار دیا گیا کہ کسی عورت کے پوشیدہ مقامات کو دوسری عورت کے دیکھنے میں جتنی قباحت ہے اس سے زیادہ قباحت اس میں ہے کہ کوئی مرد انھیں دیکھے اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ایک عورت کے مقابلے میں زیادہ عورتوں کے معائنہ کرنے میں قباحت بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ احتیاط اسی میں بتائی گئی ہے کہ ایک سے دو تین عورتوں کی شہادت ہو[2]۔

---

[1] فتح الباری ۵ / ۱۹۹، ۱۴۹ [2] ہدایہ ۳/ ۱۵۴ عورت کی شہادت کے موضوع پر اسلام کے نقطۂ نظر کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب "عورت اسلامی معاشرہ میں"

عورت اور سیاسی قیادت

عورت اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہو سکتی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ[1] — وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کر دیئے۔

اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے اور یہ استدلال بالکل صحیح ہے کہ عورت اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جو اقدام کسی قوم کے لئے موجب فلاح نہ ہو اور وہ اسے تباہی و خسران کی طرف لے جانے والا ہو اس سے اس کا احتراز کرنا ضروری ہے۔

نماز کی امامت سے استدلال

اس کی تائید ایک اور پہلو سے بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ امامت کبریٰ کو امامت صغریٰ یعنی نماز کی امامت پر قیاس کیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں نماز کی امامت کے لئے صحابہ کے درمیان میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آگے بڑھایا تھا تو صحابہ کرام نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ امامت کبریٰ کے بھی سب سے زیادہ اہل ہیں۔

جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کر سکتی[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ امامت کبریٰ کے لئے وہ بدرجہ اولیٰ موزوں نہیں ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبیؐ الی کسریٰ وقیصر۔ ترمذی۔ ابواب الفتن۔ [2] امام شافعی کے نزدیک اگر جماعت صرف عورتوں کی ہو تو عورت ان کی امامت کر سکتی ہے۔ ابوثور اور طبری نے عورت کی امامت کو مطلقاً جائز قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مردوں کی امامت بھی کر سکتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ابن رشد نے لکھا ہے یہ ایک شاذ رائے ہے۔ بدایۃ المجتہد ۱/ ۱۲۸۔ ۱۲۹

کیا عورت کے ساتھ تعصب ہے؟

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں عورت کے ساتھ تعصب برتا گیا ہے اور اسے ایک طرح سے اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔

اسلام میں سربراہ مملکت کی ذمہ داریاں

یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلام میں مملکت کے سربراہ کی حیثیت تاج برطانیہ کی طرح محض قانونی سربراہ کی نہیں ہے۔ وہی اصلاً ملکی معاملات میں مسئول اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الامام الذی علی الناس	امام جو لوگوں کا سربراہ ہے۔ وہ راعی اور
راع وھو مسئول عن	اور نگراں ہے اس سے اپنی رعیت کے بارے
رعیتہ[1]	میں پوچھا جائے گا۔

ہمارے علماء نے لکھا ہے کہ اسلامی مملکت کے لیے سربراہ کا ہونا اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ احکام شریعت نافذ کرے، اللہ کے حدود قائم کرے، دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرے، مال غنیمت صحیح طریقے سے تقسیم کرے، مالیات کا نظم کرے۔ بغاوت اور بدامنی کو روکے، ہر حال میں عدل و انصاف قائم کرے، یتیموں اور لاوارثوں کے مسائل حل کرے وغیرہ۔

اتنی بھاری ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ سربراہ مملکت ایسے شخص کو ہونا چاہئے جو انتہائی باہوش اور صاحب تدبیر ہو، بڑی عقل و فراست رکھتا ہو، رعب اور دبدبے والا ہو، مضبوط اعصاب اور قوت ارادی کا مالک ہو، علم، تقویٰ، انتظامی صلاحیت اور شجاعت اس کے اندر ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بیک وقت یہ ساری خصوصیات مرد میں بھی کم ہی پائی جاتی ہیں، عورت میں توان کا پایا جانا اور بھی دشوار ہے۔

سربراہِ مملکت یا امام کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ عوامی زندگی گزارے،

---

[1] بخاری کتاب الاعتصام باب قول اللہ واطیعوا اللہ

جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھائے اور حج کا امیر ہو۔ ان تمام باتوں کا مقصد یہ ہے کہ عام لوگوں سے اس کا ربط ضبط رہے، وہ آسانی سے اس سے مل سکیں اور وہ خود بھی ان کے حالات سے براہِ راست واقف ہو سکے۔[1]

عورت یہ ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتی

عورت کے لئے اسلامی حدود و معاشرت کی پابندی کرتے ہوئے اس طرح کی پبلک زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اپنی قوت و صلاحیت، انداز فکر، رجحان اور جذبات و احساسات کسی بھی پہلو سے سیاست کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔

کیا عورت دوسری اجتماعی ذمہ داریاں اٹھا سکتی ہے؟

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس بحث کا تعلق حکومت کی سربراہی یا امامتِ کبریٰ سے ہے۔ اس سے کم تر درجہ کی اجتماعی ذمہ داریاں اسے سونپی جا سکتی ہیں یا نہیں اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ فقہ حنفی کی رو سے حدود و قصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں اسے قاضی بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے:-

یجوز قضاء المرأۃ فی کل شیئ الا فی الحدود والقصاص[2]	حدود و قصاص کے علاوہ دیگر معاملات میں فیصلہ کرنا عورت کے لیے جائز ہے۔

اسی طرح اسے اوقاف کی نگراں اور یتیموں کی سرپرست بھی بنایا جا سکتا ہے۔[3]

ان تفصیلات پر جو شخص بھی سنجیدگی سے غور کرے گا اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام نے عورت کے ساتھ نہ تو تعصب برتا ہے اور نہ کسی قسم کی زیادتی کی ہے بلکہ اس پر وہی ذمہ داریاں ڈالی ہیں جن کو وہ آسانی سے اٹھا سکتی ہے۔ جو ذمہ داریاں اس کی طاقت سے باہر ہیں ان سے اسے سبک دوش کر دیا ہے۔ یہ ناانصافی نہیں عین انصاف ہے۔[4]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے شرح عقائد نسفی ص ۱۱۲-۱۱۳ [2] ہدایہ ۲/ ۱۲۰ [3] درالمختار مع ردالمحتار ۴/ ۹۲

[4] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'عورت — اسلامی معاشرہ میں'

کتابیات

کتاب میں قرآن مجید کے علاوہ جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں موضوع کے لحاظ سے ان کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے قرآن مجید کے حوالے آیات کے نیچے دیے گئے ہیں۔ البتہ دوسری کتابوں کے حوالے حواشی میں ہیں۔

تفسیر

۱۔ ابن جریر (جامع البیان فی تفسیر القرآن)، ابوجعفر محمد بن جریر طبری م ۳۱۰ھ المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۲۱ھ

۲۔ ابن کثیر (تفسیر القرآن العظیم)، عمادالدین اسماعیل م ۷۷۴ھ مطبعۃ مصطفیٰ محمد۔ مصر ۱۳۵۶ھ

۳۔ احکام القرآن ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص الحنفی م ۳۷۰ھ المطبعۃ البہیہ مصر ۱۳۴۷ھ

۴۔ احکام القرآن۔ ابن العربی المالکی م ۵۴۳ھ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۳۱ھ

۵۔ بیضاوی (انوار التنزیل واسرار التاویل) القاضی ناصرالدین البیضاوی م ۶۸۵ھ مطبع احمدی ۱۲۶۹ھ

۶۔ التفسیرات الاحمدیہ فی بیان الآیات الشرعیہ۔ الشیخ احمد المدعو ملا جیون م ۱۱۳۰ھ مطبع مجید برقی پریس دہلی ۱۳۲۹ھ

۷۔ تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب) فخرالدین محمد الرازی م ۶۰۶ھ المطبعۃ العامرہ الشرفیہ مصر ۱۳۰۸ھ

۸۔ السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر۔ محمد شربینی الخطیب م ۹۷۷ھ مطبع منشی نول کشور۔ لکھنؤ

۹۔ الکشاف عن حقائق التنزیل۔ ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر الزمخشری م ۵۳۸ھ مطبع الیثی کلکتہ ۱۲۷۶ھ

۱۰۔ معالم التنزیل (تفسیر خازن کے حاشیہ پر چھپی) ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی م ۵۱۶ھ مطبعۃ التقدم العلمیہ۔ مصر ۱۳۲۹ھ

۱۱۔ المنار (تفسیر القرآن الحکیم) السید محمد رشید رضا م ۱۹۳۵ء مطبعۃ المنار مصر ۱۳۶۵ھ

حدیث

۱۲۔ التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر۔ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی م ۸۵۲ھ مطبع انصاری دہلی ۱۳۰۷ھ

۱۳- جامع ترمذی — ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی م ۲۷۹ھ

۱۴- الجوہر النقی علی سنن الکبریٰ للبیہقی علاء الدین (ابن الترکمانی) (سنن الکبریٰ البیہقی) کے حاشیہ پر چھپی ہے)

۱۵- الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ - شہاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی مجوب المطابع ۱۲۵۰ھ

۱۶- سنن نسائی ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی م ۳۰۳ھ

۱۷- سنن ابن ماجہ ابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ بن ماجہ القزوینی م ۲۷۳ھ

۱۸- سنن دارمی ابوعبداللہ الدارمی م ۲۵۵ھ

۱۹- سنن دارقطنی علی بن عمر الدارقطنی م ۳۸۵ھ مطبع فاروقی دہلی

۲۰- سنن بیہقی (السنن الکبریٰ) ابوبکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی م ۴۵۸ھ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۵۵ھ

۲۱- سنن ابی داؤد ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی م ۲۷۹ھ

۲۲- صحیح بخاری (الجامع الصحیح) محمد بن اسماعیل البخاری م ۲۵۶ھ

۲۳- صحیح مسلم ابوالحسین مسلم بن الحجاج م ۲۶۱ھ

۲۴- موطا امام مالک مالک بن انس بن مالک م ۱۷۹ھ

۲۵- مسند احمد احمد بن حنبل الشیبانی م ۲۴۱ھ المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۱۳ھ

۲۶- مشکوٰۃ المصابیح ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی م ؟

شروح حدیث

۲۷- تحفۃ الاحوذی مولانا عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم المبارکفوری م ۱۳۵۳ھ مطبع جید برقی پریس دہلی ۱۳۴۶ھ

۲۸- التعلیق المغنی علی سنن دارقطنی مولانا شمس الحق عظیم آبادی م؟ دارقطنی کے حاشیہ پر چھپی ہے۔

۲۹- التیسیر بشرح الجامع الصغیر علامہ عبدالروف المناوی م ۱۶۲۱ء دارالطبعۃ العامرہ مصر ۱۲۸۲ھ

۳۰- حاشیہ السندی علی النسائی علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی م ۱۱۳۸ھ نسائی مطبوعہ مجتبائی دہلی کے حاشیہ پر چھپا ہے۔

۳۱- شرح الزرقانی علی الموطا - محمد بن عبدالباقی بن یوسف بن احمد شہاب الدین الزرقانی م ۱۶۸۸ء مطبعہ خیریہ مصر ۱۳۱۰ھ

۳۲- شرح معانی الآثار — احمد بن سلیمان الازدی الطحاوی م ۹۳۳ء

۳۳۔ شرح صحیح مسلم — محی الدین ابوزکریا یحییٰ النووی م ۶۷۶ھ — اصح المطابع ۱۳۴۹ھ۔

۳۴۔ فتح الباری — شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی بن حجر م ۸۵۲ھ — المطبعۃ الخیریۃ مصر ۱۳۲۹ھ۔

۳۵۔ فیض الباری علی صحیح البخاری — علامہ انور شاہ کشمیری م ۱۳۵۲ھ — مطبع حجازی قاہرہ ۱۳۵۷ھ

۳۶۔ معالم السنن — ابوسلیمان احمد بن محمد الخطابی م ۳۸۸ھ — مطبع العلمیہ حلب ۱۳۵۱ھ

فقہ وفتاوی

۳۷۔ الافصاح عن معانی الصحاح۔ الوزیر عون الدین ابو المظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ الحنبلی م ۵۶۰ھ مطابع الرجبی القاہرہ۔

۳۸۔ اعلام الموقعین عن رب العلمین — ابن قیم الجوزیہ م ۷۵۱ھ — ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر

۳۹۔ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد — محمد بن احمد ابن رشد القرطبی م ۱۱۹۸ء — مصر ۱۹۶۶ء

۴۰۔ حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر — احمد بن محمد الصاوی م ۱۲۴۱ھ — الشرح الصغیر کے حاشیہ پر بھی

۴۱۔ الدرالمختار — محمد علاء الدین الحنفی م ۱۰۸۸ھ — الردالمختار کے حاشیہ پر چھپی ہے۔

۴۲۔ الردالمختار علی الدرالمختار — محمد امین ابن عابدین م ۱۸۳۶ء — مطبع عثمانیہ مصر ۱۳۲۷ھ

۴۳۔ الشرح الصغیر علی اقرب المسالک الی مذہب الامام مالک — علامہ احمد بن محمد الدردیر م ۱۷۸۶ء — دارالمعارف مصر ۱۳۹۲ھ

۴۴۔ شرح الوقایہ مع حاشیہ عمدۃ الرعایہ۔ عبیداللہ بن مسعود بن تاج الشریعہ م ۷۴۷ھ مطبع قیومی کانپور ۱۹۱۶ء

۴۵۔ العنایہ (شرح الہدایہ) اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی م ۱۳۸۴ء فتح القدیر کے حاشیہ پر چھپی۔

۴۶۔ فتح القدیر للعاجز الفقیر (شرح الہدایہ) کمال الدین محمد بن عبدالواحد (ابن الہمام) الحنفی م ۶۸۱ھ المطبعۃ الکبری الامیریہ مصر ۱۳۱۵ھ۔

۴۷۔ الکفایہ علی الہدایہ (شرح الہدایہ) جلال الدین الخوارزمی م؟ کلکتہ ۱۸۳۲ء

۴۸۔ المغنی علی مختصر ابی القاسم الخرقی — ابو محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ المقدسی م ۶۲۰ھ مکتبۃ الریاض الحدیثہ ۱۹۸۱ء

۴۹۔ مجموعہ فتاوی شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ۔ جمع وترتیب عبدالرحمٰن بن محمد بن قاسم — دارالعربیہ لبنان ۱۳۹۸ھ

۵۰۔ المحلی۔ ابومحمد علی بن احمد ابن حزم م ۴۵۶ھ — ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۵۲ھ

۵۱۔ الہدایہ (شرح ہدایۃ المبتدی) برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی م ۱۱۹۶ء
مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۳۱ء

عقائد

۵۲۔ شرح عقائد نسفی سعد الدین التفتازانی م ۷۹۲ھ رشیدیہ دہلی

لغت

۵۳۔ الدر النثیر علی ہامش النہایہ جلال الدین السیوطی م ۹۱۱ھ
۵۴۔ القاموس المحیط مجد الدین محمد الفیروزآبادی م ۸۱۰ھ مطبع نول کشور لکھنو
۵۵۔ لسان العرب ابن منظور م ۷۱۱ھ دار صادر دار بیروت ۱۳۷۶ھ
۵۶۔ المفردات فی غریب القرآن امام راغب اصفہانی م ۱۱۰۸ء المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۲۲ھ
۵۷۔ النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ابن الاثیر الجزری م ۶۰۶ھ المطبعۃ العثمانیہ مصر ۱۳۱۱ھ

اردو کتب و رسائل

۵۸۔ ماہنامہ برہان دہلی
۵۹۔ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ
۶۰۔ ہفت روزہ دعوت "مسلم پرسنل لا نمبر" نئی دہلی
۶۱۔ ماہنامہ زندگی رام پور
۶۲۔ عورت اسلامی معاشرہ میں سید جلال الدین عمری مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
۶۳۔ عورت اور اسلام سید جلال الدین عمری مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی
۶۴۔ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ۔
۶۵۔ قومی آواز نئی دہلی۔

www.KitaboSunnat.com